ماہنامہ

آنکھ مچولی

شمارہ یوم پاکستان

مارچ ۱۹۹۱ء

لذّت میں لاثانی ۔ پکانے میں آسانی !

احمد کھیر مکس

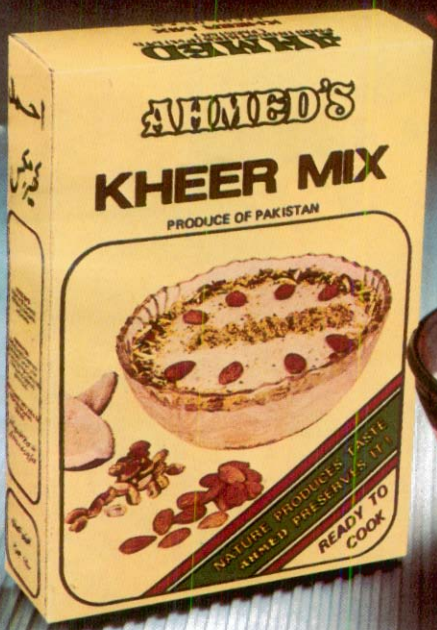

متوازن اور معیاری اجزاء
بہترین اور مثالی صفائی

احمد

کا بین الاقوامی معیار آپ کے اعتماد کی ضمانت !

Scancraft

موسمِ بہار کی آمد کے ساتھ ہی گلستانوں میں نئی کونپلیں پھوٹتی ہیں، رنگارنگ پھول کِھل اٹھتے ہیں، چہروں پہ شادابی جھلکنے لگتی ہے اور آنکھوں میں صحت و تن درستی سے بھرپور ایک نئی چمک پیدا ہو جاتی ہے۔ چہار سو پھیلی ہوئی ان رعنائیوں کے موسم میں اگر چہرہ بے آب اور آنکھیں بے رونق نظر آئیں تو سمجھ لیجیے کہ آپ کو اپنی صحت اور تن درستی پر مزید توجّہ کی ضرورت ہے۔

صاف خون صحت کی علامت بھی ہے اور ضرورت بھی۔ اگر خون میں فاسد مادّے سرایت کر جائیں تو یہ پھوڑے، پھنسیوں، مہاسوں اور کئی دوسری جِلدی بیماریوں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔

موسمِ بہار میں صافی کے باقاعدہ استعمال سے اپنے جسم میں گردش کرنے والے خون کو صاف اور صحت مند رکھیے تاکہ یہ آپ کے چہرے پر حُسن بن کر جھلکے اور اسے بہار کی سی تازگی بخشے۔

جڑی بوٹیوں سے تیار شدہ

صافی

سے خون صاف
چہرہ شاداب

ہم خدمتِ خلق کرتے ہیں

اسوۂ اخلاق
عدل و انصاف رُوحِ اسلام ہے

ADARTS

HSF-1/88

تتلی

آنکھ مچولی کھیلنے والے کمسن طلبا کے لئے
آنکھ مچولی کا خوبصورت تحفہ

جب کبھی ہمیں ننھے منے بچے کہیں مل جاتے تھے اور ہم ان سے پوچھتے تھے "ہاں بھئی بچو! کہو..... آنکھ مچولی کیسا لگتا ہے؟" تو وہ جواب میں کہتے تھے "انکل! بہت اچھا۔ مگر اس میں ہم لوگوں کے لئے کوئی کہانی ہوتی ہی نہیں ہے۔" جب بہت سارے ننھے بچوں نے یہی شکایت کی تو ہم بھی سوچنے پر مجبور ہوگئے۔ پھر ہمیں بھی لگا کہ واقعی بہت چھوٹے بچوں کے لئے تو اس میں کچھ ہوتا ہی نہیں ہے۔ ایسے بچوں کے لئے جو ابھی لکھ پڑھ نہیں سکتے۔ جنھیں ابھی صرف ان کے ابو یا امی رات سوتے وقت کہانیاں سناتے ہیں اور اچھی اچھی باتیں بتاتے ہیں۔

آنکھ مچولی سارے بچوں کو اپنا ساتھی..... اپنا دوست سمجھتا ہے تو بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے ننھے منے دوستوں کو بھول جائے۔ اس شمارے کے ساتھ ان پھول جیسے بچوں کے لئے ایک مناسار سالہ "تتلی" تحفے میں دیا جارہا ہے۔ "تتلی" جو پھولوں پر اڑتی ہے۔ بچے جو "تتلی" کے پیچھے بھاگتے ہیں..... وہی تتلی..... پیاری سی اب ان کے ہاتھوں میں ہے۔!

بچوں کے محبوب مصنف سید نظر زیدی کے قلم سے

بچوں کے لئے تاریخی ناول

آزادی

آئندہ شمارے سے ملاحظہ کیجئے

سترہ سالہ نوجوان کی داستان زندگی جس نے تاریخ کے دھارے کا رخ موڑ دیا
جس نے سندھ کو فتح کیا اور پاکستان کی بنیاد کی پہلی اینٹ رکھی۔
حقیقت اور افسانے کا دلکش امتزاج۔
محمد بن قاسم کے کارناموں کا دلچسپ احوال

حرف حرف تازگی، لفظ لفظ روشنی

• آڈٹ بیورو آف سرکولیشن سے تصدیق شُدہ اشاعت ◎ رُکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی ◎ رُکن آل پاکستان چلڈرنز میگزین سوسائٹی

بہترین رسالے کا ایوارڈ حاصل کرنے والا پاکستانی بچوں کا واحد ماہنامہ

نئی نسل کے ادب کا بین الاقوامی معیار

آنکھ مچولی

مدیر اعلیٰ
ظفر محمود شیخ

مدیر مسئول
تجمل حسین چشتی

مشاورت
مشفق خواجہ امجد اسلام امجد

مدیران اعزازی
طاہر مسعود محمد سلیم مغل

مجلس ادارت
شاہ نواز فاروقی ساجد سعید منیر احمد راشد

اشتہارات
محمد عرفان

سرکولیشن
ریاض احمد

□ ماہنامہ آنکھ مچولی میں شائع ہونے والی تمام تحریروں کے جُملہ حقوق بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ پیشگی اجازت کے بغیر کوئی تحریر شائع نہیں کی جا سکتی۔

□ ماہنامہ آنکھ مچولی میں شائع ہونے والی قرآن وحدیث پر مبنی تحریروں کے علاوہ کہانیوں کے کردار وواقعات فرضی ہیں کسی اتفاقیہ مماثلت کی صورت میں ادارہ ذمّہ دار نہ ہوگا۔

□ ماہنامہ آنکھ مچولی کو گرین گائیڈ اکیڈمی نے ضمیر الدین میموریل آرگنائزیشن کے زیرِ سرپرستی بچّوں کی ذہنی اور علمی صلاحیتوں میں اضافے اور سیرت وکردار کی تعمیر کے لیے شائع کیا۔

جلد : ۵ شمارہ : ۹ مارچ ۱۹۹۱ء شعبان/ رمضان ۱۴۱۱ھ فون: ۲۹۹۱۷۸

ناشر : ظفر محمود شیخ ، طابع : زاہد علی ، مطبع : لاریب پرنٹنگ پریس ایم اے جناح روڈ، کراچی
خط وکتابت کا پتہ : ماہنامہ آنکھ مچولی - گرین گائیڈ اکیڈمی - ۱۱۲-ڈی ، نورس روڈ سائٹ ، کراچی

قیمت
۱۰ روپے ۷ درہم ۷ ریال

حُسنِ ترتیب

تاریخ کے دریچے سے
(ادارہ) ۸

نعت (نظم)
حافظ بشیر آزاد ۹

پہلی بات
ظفر محمود شیخ ۱۱

ڈیئر ایڈیٹر
ادارہ ۱۳

۲۳ مارچ (نظم)
محمد انوار احمد ۱۷

بزدل امریکی چوہے
سلمیٰ سلیم ۱۸

امانت
طاہر مسعود ۲۰

حق کی گواہی
زبیر طارق ۲۶

دادا ابّا کی عینک
سیّد نظر زیدی ۳۱

یوآکری کے تعاقب میں
انگر انوار اعوان ۳۸

کالے بادل (نظم)
شاہنواز فاروقی ۴۴

صلۂ شہید کیا ہے
شبانہ احمد سولنگی ۴۵

شکر ہے بھرم رہ گیا
قاری سیف الدین ۵۱

بیراگی
نیر مسعود ۵۶

وقت (نظم)
فضل ربی راہی ۶۴

کہانیاں
شیخ عبدالقادر ۶۵

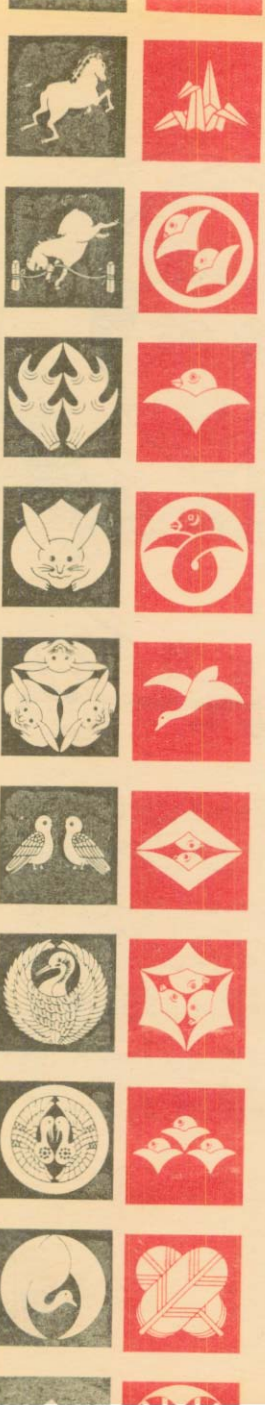

حُسنِ ترتیب

ڈنڈا ڈولی
قارئین ۶۹

خلیج کی جنگ
محمد صالح ارشاد ۸۲

فطرت کی دُنیا
شین فاروقی ۹۱

مارچ اور قراردادِ پاکستان
غلام عباس طاہر ۱۰۰

لوٹ پیچھے کی طرف
بن یامین ۱۰۷

ایک ڈاکو جو ادیب بن گیا
سلمان صدیق ۱۱۵

چھوٹی سی بات
عطا حسین ملک ۱۲۰

روشن مثال
تعارف ۱۳۳

کورونا ڈو کے بھوت
شاہنواز فاروقی ۷۵

ایک رات
منیر احمد راشد ۸۶

آخری جیت
ریاض احمد خان ۹۵

استاد سہ ۱۲
محمد پرویز آرائیں ۱۰۳

روزہ بھوکا رہنے کا نام نہیں
ساجد سعید ۱۱۱

ایک پرانی کہانی (نظم)
فیروز خرم ۱۱۸

کمسن قلمکار
قارئین ۱۲۳

امی ابو کا صفحہ
ہما سلیم ۱۳۸

تاریخ کے دریچے سے

گورنر ہاؤس کراچی میں جب قائد اعظم قیام پذیر ہوئے ہیں تو گورنر جنرل ہاؤس میں کوئی پردہ، کوئی فرنیچر، کوئی قالین غرضیکہ کوئی بھی چیز تبدیل نہیں کی۔ صرف اس خیال سے کہ جب کام چل سکتا ہے تو خواہ مخواہ قومی پیشہ کیوں ضائع کیا جائے۔ جب کوئی پارٹی ہوتی تو صرف ایک دو مشروب رکھے جاتے۔ مہمانوں کی تواضع ضرور کی جاتی، لیکن اس انداز سے کہ قومی پیسہ ضائع نہ ہونے پائے۔ محترمہ فاطمہ جناحؒ بھی پیسے کے استعمال میں احتیاط برتتی تھیں، بعد میں تو ہم نے دیکھا کہ ایک معمولی سا وزیر بھی جب کسی بنگلہ میں آتا ہے یا دفتر کا چارج سنبھالتا ہے تو اس کی ہر چیز الٹ پلٹ دیتا ہے۔ ہزاروں روپیہ آرائش و زیبائش پر لگا دیا جاتا ہے۔ قائد اعظم کے ہاں یہ چیز نہیں تھی وہ قومی پیسے کو امانت سمجھتے تھے۔ اصراف قطعاً پسند نہیں کرتے تھے۔

(بحوالہ ..... دی گریٹ لیڈر، زیر طبع)

نعت

حافظ بشیر آزاد

کتنا اونچا ہے آقاؐ مقام آپؐ کا
دونوں عالم میں ہے احترام آپؐ کا
جتنا تسکینِ جاں ہے کلام آپؐ کا
اتنا راحت فزا بھی ہے نام آپؐ کا
عاصیوں کی شفاعت ہے کام آپؐ کا
کتنا اونچا ہے آقا مقام آپؐ کا

جنتیں آپؐ کی ..... نکہتیں آپؐ کی
سارے عالم کی ہیں رونقیں آپؐ کی
جلوتیں آپؐ کی، خلوتیں آپؐ کی
دولتیں آپؐ کی، نعمتیں آپؐ کی
لکھ دیا حق نے ہر شے پہ نام آپؐ کا
کتنا اونچا ہے ..... آقا مقام آپؐ کا

اللہ اللہ ..... یہ آپؐ کا مرتبہ
آپ محبوبِ حق ..... خاتم الانبیاء
بے کسوں، ناتوانوں کے حاجت روا
کوئی عالم میں ثانی نہیں آپؐ کا
روزِ محشر بھی ہے ..... احتشام آپؐ کا
کتنا اونچا ہے آقا مقام آپؐ کا

ایک چشمِ کرم کا طلبگار ہوں
سخت مجبور، رنجور ..... لاچار ہوں
ایک انساں کے ناطے خطا کار ہوں
اس لئے مغفرت کا سزاوار ہوں
دین و ایماں کی جاں ہے نظام آپؐ کا
کتنا اونچا ہے آقاؐ مقام آپؐ کا

خصوصی بچت اسکیم

آنکھ مچولی کے ۱۲ شمارے کتنے سستے کتنے پیارے

۵۰ روپے کی خصوصی رعایت اور تحفہ مفت

آنکھ مچولی کے بارہ شماروں کی قیمت
مع دو خاص شمارے اور رجسٹرڈ ڈاک خرچ
۲۱۰ روپے بنتی ہے، لیکن سالانہ ممبر شپ حاصل کرنے والوں کے لیے خصوصی رعایت یعنی ۲۱۰ کے بجائے صرف **۱۵۰** روپے۔ اس طرح گویا
مالی منفعت بھی اور علمی فائدہ بھی

زرِ سالانہ کی رقم دفتر کے پتے پر منی آرڈر کریں اور کوپن پُر کر کے ہمیں بھجوا دیں

آنکھ مچولی بیرونِ ملک منگوانے کے لئے زرِ سالانہ مبلغ ۳۰۰/- روپے

سالانہ ممبر شپ آنکھ مچولی ۱۱۲/ڈی سائٹ کراچی نمبر ۱۶

پہلی بات

آدھی صدی ہونے کو آئی جب برصغیر کے مسلمانوں نے اپنے لئے ایک وطن کا مطالبہ کیا تھا۔ کیونکہ مسلمانوں سمجھتے تھے کہ متحدہ ہندوستان میں ان کا مستقبل محفوظ نہیں ہے۔ جونہی انگریز رخصت ہوں گے ہندو اکثریت مسلمانوں پر مسلط ہو جائے گی اور ان کا جینا دوبھر ہو جائے گا۔

مسلمانوں کا یہ اندیشہ کچھ ایسا غلط بھی نہ تھا۔ وہ انگریز دورِ حکومت ہی میں کانگریس راج کا مزہ چکھ چکے تھے۔ ہندوؤں کی جماعت کانگریس کو جب عبوری حکومت کا موقع ملا تو اس نے اردو کی جگہ ہندی کو نافذ کر دیا۔ اسکولوں میں ہندوؤں کے ترانے "بندے ماترم" کو قومی ترانے کی جگہ مل گئی۔ ایسی کتابیں پڑھائی جانے لگیں جن میں مسلمانوں کی تاریخ اور ان کے مذہب کی توہین کی جاتی تھی۔ مسلمانوں کے حامی اخبارات پر پابندیاں لگا دی گئیں۔ عدالتوں میں مسلمانوں پر انصاف کے دروازے بند کر دیئے گئے۔ حد تو یہ کہ حکومت میں مسلمانوں کو کوئی حصہ نہیں دیا گیا۔ کانگریس نے یہاں تک اعلان کر دیا کہ ہندوستان میں اب صرف دو ہی طاقتیں ہیں۔ کانگریس اور حکومتِ برطانیہ۔ گویا ان کی نظر میں مسلمانوں کا کوئی وجود ہی نہیں تھا۔ تب کہیں مسلمانوں کی آنکھیں پوری طرح کھل گئیں۔ اور یہی وہ موقع تھا جب قائداعظم نے للکار کر کہا۔ "ایک اور قوت بھی ہے۔ اور وہ ہے مسلمان!"

۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کی قرارداد انہی حالات کی وجہ سے پیش کی گئی تھی اور دلچسپ بات یہ ہے کہ اس قرارداد میں "پاکستان" کا لفظ کہیں بھی درج نہیں تھا۔ لیکن قرارداد کے پیش ہوتے ہی ہندو پریس نے اسے "قراردادِ پاکستان" قرار دیا، جسے مسلمانوں نے قبول کر لیا۔ خدا کا شکر کہ مسلمانوں کو ان کی منزل مل گئی۔ اگر پاکستان نہ بنتا تو آج مسلمانوں کی حالت وہی ہوتی جو کشمیر کے مسلمانوں کی ہے، جو پنجاب کے سکھوں کی ہے۔ بلاشبہ پاکستان ایک نعمت ہے جس کا شکر ہم بہت کم بجالاتے ہیں۔ ہماری کوتاہی یہ ہے کہ ہم بہت جلدی یہ بھول گئے کہ اس ملک کے لئے ہم نے کتنی قربانیاں دی تھیں۔ آزادی کے بعد سے آج تک ہم زبان، نسل اور مذہب کے نام پر آپس میں جھگڑا کرتے رہے ہیں ہم نے ہمیشہ اپنی تکلیفوں کا ذمہ دار دوسرے کو ٹھہرایا۔ عزت کی روکھی سوکھی روٹی کے بجائے مانگے تانگے کی امداد پر بھروسہ کیا۔ ہم نے کبھی نہیں سوچا کہ اپنے دکھوں اور مصیبتوں کے ذمہ دار ہم خود ہیں، ہمارے راہنما ہیں۔ آدھی صدی بعد..... مارچ کا یہ مہینہ ہم سے پوچھ رہا ہے۔ "کیا ہم اب بھی نہ جاگیں گے؟"

آپ کا دوست
ظفر محمود شیخ

ہم پھر چلے ہیں وادی حیرت کی سیر کو

حیرت تخلیق کا سرچشمہ ہے۔ حیرت معصومیت کی پہچان ہے۔
ہماری دنیا حیرتوں کا سمندر ہے۔ اور ہم اس کی حیران مخلوق
ہم اس سمندر کو "حیرتناک نمبر" کے کوزے میں بند کر کے جولائی ۹۱ء میں
آپ کی نذر کر رہے ہیں۔
اس نمبر کی چند حیرت بکھیرنے والی پھلجڑیاں

- ..... وہ کہانیاں جنہیں پڑھ کر آپ مارے حیرت کے پلکیں جھپکنا بھول جائیں۔
- ..... ایسے واقعات جن کو پڑھ کر آپ کے منہ حیرت سے انگریزی حرف ○ کی طرح ہو جائیں۔
- ..... ایسی تصاویر جن پر آپ کے لئے یقین کرنا مشکل ہو جائے۔
- ..... علامہ حیرت کے حیرت ناک انکشافات.....
- ..... حیرت کے سمندر میں ڈوبتے ابھرتے قصے اور حیرت کی کشتی میں سوار حیران کن "تحفہ"
- ..... اس کے علاوہ وہ سب کچھ جو آپ کو حیرت میں ڈال دے

آپ بھی اس نمبر کے لئے جلد کچھ لکھ کر بھیجئے۔

آنکھ مچولی کا "حیرت ناک نمبر۔"
آپ پڑھیں گے جیسے جیسے
آپ کہیں گے کیسے کیسے؟

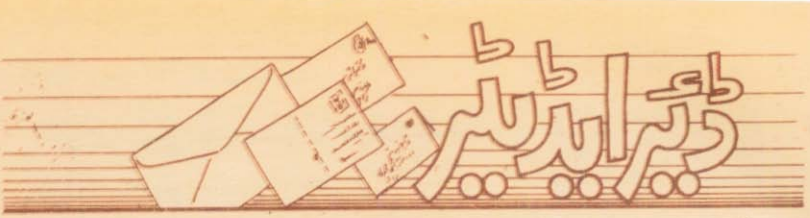

مہوش عابد .... خانپور

"اطفال نمبر پڑھ کر دل خون کے آنسو رو پڑا کیوں کہ آپ نے آج تک میری ایک بھی تحریر شائع نہیں کی۔ پلیز آپ اپنی ردی کی ٹوکری کو سمجھائیں کہ وہ میری اس نظم کو نہ کھائے۔"

○ .... امید ہے اب آپ کا دل خون کے آنسو نہیں روئے گا کیوں کہ ہم آپ کی ایک تحریر شائع کر رہے ہیں۔ دیکھئے نا آپ کا خط بھی تو آپ کی تحریر ہے۔ آپ کی نظم شائع ہو سکتی تھی اگر اس کے شعروں میں وزن ہوتا اور اس کی بحریں درست ہوتیں۔ چنانچہ ردی کی ٹوکری کو سمجھانا ناممکن ہے۔ ویسے ہماری ردی کی ٹوکری اتنی پیٹو نہیں ہے جتنا کہ آپ لوگ سمجھتے ہیں۔

عبداللہ شیخ گوہر .... حیدر آباد

آنکھ مچولی کا اطفال نمبر دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ آپ نے اپنا کہا پورا کیا۔ آپ نے جس انتھک محنت سے رسالے کو ترتیب دیا اس پر آپ اور آنکھ مچولی کا عملہ ڈھیر ساری تعریفوں کا مستحق ہے۔

○ .... اطفال نمبر دیکھ کر آپ کا دل باغ باغ ہوا۔ ذرا بتائیے تو اس باغ میں کون کون سے درخت ہیں، ؟ ممکن ہو تو اپنے اس باغ کے کچھ پھل ہمیں بھی بھیج دیجئے۔ ویسے آپ کا یہ خط اسی باغ کا پھل محسوس ہوتا ہے۔ میٹھا اور لذیذ۔ آپ کی مبارک باد پورے عملے تک پہنچا دی گئی ہے۔

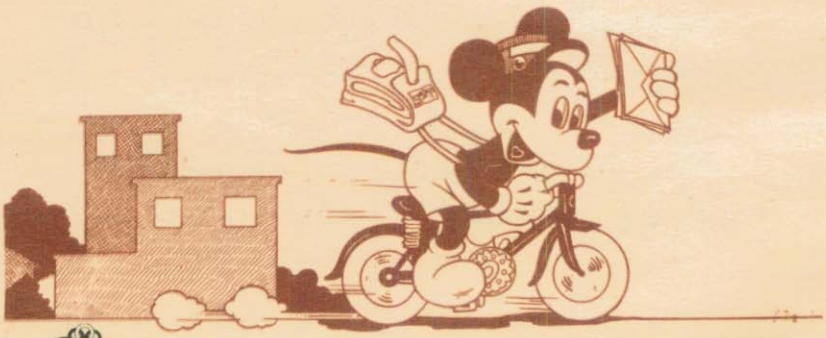

سیما اسحاق ..... رامسوامی کراچی

اطفال نمبر بہت تاخیر سے ملا بک اسٹالوں کے چکر کاٹتے کاٹتے پاؤں تھک گئے۔ پھر سات تاریخ کو رسالہ دیکھتے ہی غصہ گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب ہو گیا۔ تحفہ کمال کا تھا۔ کوشش کے باوجود رسالے میں کوئی غلطی نہ نکال سکے۔ آنکھ مچولی کا معیار بہت بلند ہو گیا ہے۔

○ ..... بھئی سیما اچھی چیز عام طور پر مشکل اور تاخیر سے ہی ملتی ہے۔ ویسے ہم آئندہ آپ کے پیروں کی تھکن کا خیال رکھیں گے۔ خدا کرے کہ آپ کا غصہ مسلسل گدھے کے سینگوں کی عادت اپناتا رہے۔ رسالے کی تعریف اور ہماری حوصلہ افزائی کا شکریہ۔

رابعہ بے بی ..... کوہاٹ

"اطفال نمبر" ملا۔ اچھا لگا، مگر کئی جگہ الفاظ کی غلطیاں تھیں۔ اور صفحات بھی الٹ پلٹ تھے۔ جائزہ صحت میں میرا نام "رابیر بے بی" شائع ہو گیا ہے۔"

○ ..... تمام تر کوششوں کے باوجود ایک آدھ غلطی ہو ہی جاتی ہے۔ آپ کے خط کی اشاعت سے آپ کے نام کی غلطی درست ہو گئی ہوگی۔

سنبل بنت ظفر ..... کراچی

○ ..... آپ کا "منظوم خط" ملا۔ تنقید اور تعریف دونوں کا شکریہ۔ بہتر ہے کہ خط نثر میں لکھا کریں کسی شاعر نے دیکھ لیا تو بیچارے کی دل آزاری ہوگی۔

ستارہ انجم شیخ، ٹنڈو آدم

اطفال نمبر پڑھا بہت شاندار تھا۔ منیر احمد راشد کی دو عدد کہانیاں اکو اور بونگا متاثر کن تھیں۔ شاہنواز فاروقی صاحب کی "سات دن کی حکومت" پڑھ کر مزا آگیا۔ خاص طور پر اس کا اختتام تو بے ساختہ ہنسنے پر مجبور کر گیا۔ مگر ہماری کہانی کو کسی نے گھاس نہیں ڈالی۔"

○ ..... اطفال نمبر کی پسندیدگی کا شکریہ۔ منیر احمد راشد اور شاہنواز فاروقی تک آپ کی مبارک باد پہنچ گئی۔ بھئی ہم اپنے ہر قاری کی کہانی کو کہانی سمجھتے ہیں کچھ اور تھوڑی۔ بھلا پھر ہم اسے گھاس کیوں ڈالیں گے؟

عارفہ مسعود ..... لاہور

"میں نے اس سال ایم اے فائنل ہسٹری کا امتحان دیا ہے۔ میری چھوٹی بہن آپ کا رسالہ بڑے

شوق سے پڑھتی ہے۔ میں خود بچہ بن کر یہ رسالہ پڑھتی ہوں۔ آپ جس طرح نئی نسل کو نظریہ پاکستان کا سبق دے رہے ہیں وہ قابل تعریف ہے۔"

○ ..... نظریہ پاکستان کی تبلیغ ہمارا فرض ہے۔ ہر اچھا انسان آخری عمر تک بچہ ہی رہتا ہے اس لئے آپ اس عمر میں بھی آنکھ مچولی پڑھتی ہیں ہمیں اس بات پر رتی برابر حیرت نہیں۔

مفتی عبداللطیف قادری ..... مسقط عمان

"آنکھ مچولی کو دیکھ کر بے حد مسرت ہوئی کہ پاکستان سے کم از کم ایک ایسا جریدہ تو شائع ہو رہا ہے جس سے بچوں کی ذہنی نشوونما اور صحیح معلومات میں خاطر خواہ اضافہ ہو رہا ہے۔ اطفال نمبر میں ایک جگہ غلطی ہے "رضاعی" بہن "رفاعی" بہن کے طور پر شائع ہو گیا ہے۔"

○ ..... آنکھ مچولی کی تعریف کے لئے شکریہ آپ نے جس غلطی کی طرف اشارہ کیا ہے وہ درست ہے۔ قارئین درست فرمالیں۔

محمد یوسف اکرم رحمانی ..... سانگھڑ

"ہم آپ کے سالانہ خریدار بننا چاہتے ہیں۔ اگر آپ نے ہمارے اس خط کا جواب نہ دیا تو ہم نہ صرف یہ کہ آپ کو آئندہ خط نہیں لکھیں گے بلکہ سالانہ خریدار بھی نہیں بنیں گے۔"

○ ..... سالانہ خریدار ضرور بنئے مگر عزیز آئندہ خط نہ لکھنے کی دھمکی تو کچھ ٹھیک نہیں۔ دیکھئے نا جب آپ خط میں کوئی جواب دینے والی بات ہی نہیں لکھیں گے تو ہم کیا جواب دیں گے۔ امید ہے اب آپ کی ناراضگی ختم ہو گئی ہو گی۔

صدف اعظم ..... کوئٹہ

"آج کے دور میں انگریزی آنا بہت ضروری ہے جو بچے اردو میڈیم اسکولوں میں پڑھتے ہیں وہ کالج میں جا کر مصیبت اٹھاتے ہیں کیا ہی اچھا ہو اگر آپ آنکھ مچولی کو انگریزی میں نکالنے لگیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم تفریح میں جو کچھ سیکھ لیتے ہیں اس کو کتابوں کے ذریعہ نہیں سکھ پاتے۔ میں یہ تجویز سب کے فائدے کے لئے دے رہی ہوں۔"

○ ..... زبانیں تو سب اللہ کی نشانیاں ہیں ہم جتنی زبانیں سیکھ لیں اچھی بات ہے۔ اس لئے انگریزی پر عبور حاصل کرنا بھی اچھی بات ہے لیکن چونکہ ہر انسان اپنی مادری زبان میں زیادہ اچھی طرح سوچ سکتا ہے، زیادہ اچھی طرح اپنے خیالات کا اظہار کر سکتا ہے اس لئے ہر انسان کے لئے اس کی مادری زبان میں تعلیم حاصل کرنا ہی مناسب رہتا ہے۔ یہ ہماری نہیں دنیا کے تمام مفکرین کی رائے ہے۔ خود انگریز مفکرین بھی

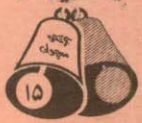

یہی کہتے ہیں۔ قائداعظمؒ کے بارے میں آپ کو معلوم ہی ہو گا کہ وہ کتنی زبردست انگریزی جانتے تھے لیکن اس کے باوجود انہوں نے کہا تھا کہ پاکستان کی قومی زبان اور ذریعہ تعلیم اردو ہوگی۔ چنانچہ ہمیں کوشش کرنی چاہئے کہ ہم ہر درجے کے لئے اردو میں عمدہ نصابی کتابیں تیار کریں۔ دنیا کی ہر ترقی یافتہ قوم نے یہی کیا ہے۔ جاپانی قوم جاپانی میں ہی تعلیم حاصل کرتی ہے۔ فرانسیسی قوم فرانسیسی میں تعلیم حاصل کر رہی ہے۔ ہمیں اس رائے سے اتفاق ہے کہ بچوں کے لئے انگریزی رسائل نکلنے چاہیں۔ اگر ہمارے اس مختصر سے جواب سے آپ مطمئن نہیں ہیں تو جوابی لفافہ ارسال کر دیجئے گا ہم آپ کو تفصیل سے جواب دے دیں گے۔

محمد ریاض انصاری، عارف آباد ..... آنکھ مچولی میں ویسے تو سب کی تحریریں چھپتی ہیں لیکن مشفق خواجہ، امجد اسلام امجد اور تجمل حسین چشتی کی تحریریں کیوں نہیں چھپتیں۔ میرا مشورہ ہے کہ رسالے کے رنگین صفحات ختم کر دیئے جائیں اور ۱۲۰ صفحات کر کے قیمت پانچ روپے مقرر کر دی جائے۔

○ ..... بھئی اگر ادارے کے سب لوگوں کی تحریریں ہم چھاپنا شروع کر دیں تو پھر آپ لوگوں کی تحریریں کیسے چھپیں گی۔ رنگین صفحات ختم کرنے کا مشورہ آپ نے تو دیا لیکن کیا سارے پڑھنے والے اس سے متفق ہوں گے؟

منظور احمد عباسی، لاڑکانہ ..... ہم نے اپنے محلے میں ایک لائبریری کھولی ہے تاکہ جو بچے تعلیم سے محروم ہیں وہ یہاں آکر پڑھ سکیں اس میں ابھی تھوڑی سی کتابیں ہیں۔ اگر آپ آنکھ مچولی بھیجنا شروع کر دیں تو ہم بہت ممنون ہوں گے۔

○ ..... آپ نے بڑا نیک کام کیا ہے۔ لائبریری کا مکمل پتہ لکھ بھیجئے۔

معذرت

چند مہینے پہلے ادارہ "آنکھ مچولی" نے اپنے پڑھنے والوں کو دعوت دی تھی کہ وہ سیاست دانوں کے نام خط لکھیں۔ اس کے جواب میں ہمیں بے شمار خطوط موصول ہوئے۔ جن میں سے منتخب خطوط شائع کر دیئے گئے۔ چونکہ زیادہ تر خطوں میں چند ہی سیاستدانوں کو مخاطب کیا گیا تھا اور ان میں باتیں بھی کم و بیش ایک ہی جیسی تھیں اس لئے اس سلسلے کو بند کر دیا گیا۔ لہٰذا ہم ان تمام قارئین سے معذرت خواہ ہیں جن کے خطوط شائع نہ ہو سکے۔ (ادارہ)

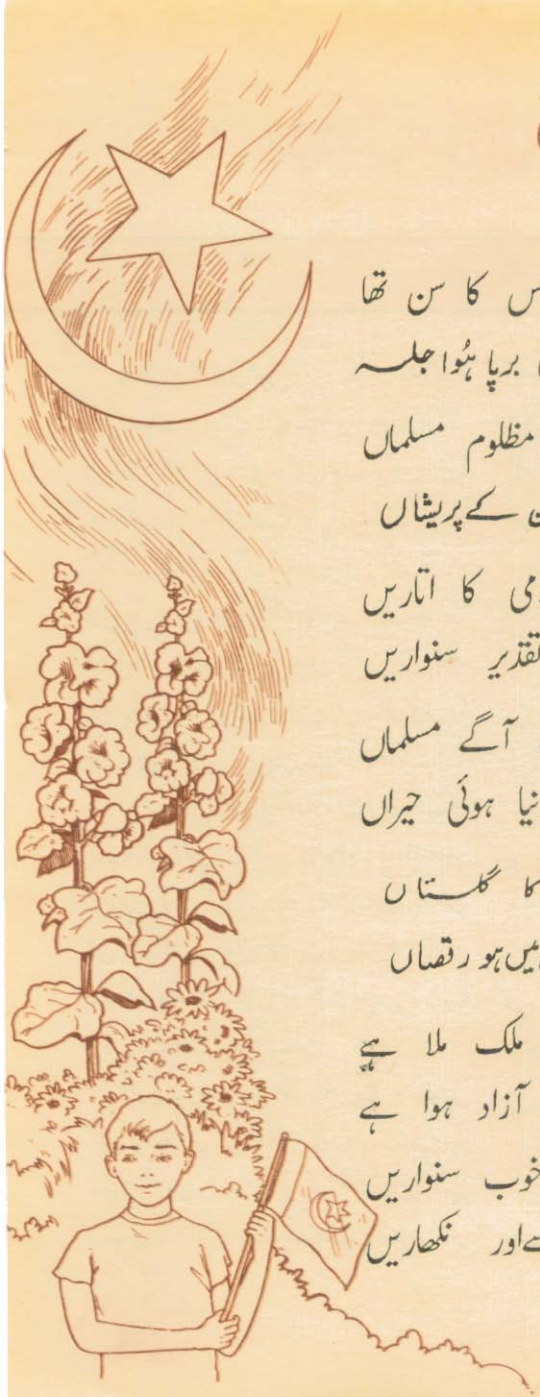

۲۳ مارچ

محمد انوار احمد

تھی مارچ کی تیئس تو چالیس کا سن تھا
لاہور کے اک پارک[1] میں برپا ہُوا جلسہ

ہر شہر سے آئے تھے یہ مظلوم مسلماں
غیروں کی حکومت سے تھے دل ان کے پریشاں

چاہا تھا کہ اب طوق غلامی کا اتاریں
بگڑی ہوئی اس قوم کی تقدیر سنواریں

بس پھر تو بصد جوش بڑھے آگے مسلماں
وہ جوش، جسے دیکھ کے دنیا ہوئی حیراں

تعمیر کیا اپنے خیالوں کا گلستاں
اک ایسا گلستاں کہ خوشی جس میں ہو رقصاں

اللہ کی رحمت، یہ ہمیں ملک ملا ہے
صدیوں کی غلامی سے جو آزاد ہوا ہے

اب فرض ہمارا ہے اسے خوب سنواریں
ہے پاک وطن اپنا اسے اور نکھاریں

[1] اقبال پارک

بُزدل امریکی چوہے

سلمیٰ سلیم

بہت سے انسانوں اور چوہوں کے درمیان ایک مشترک بات ہوتی ہے۔ چوہے بھی ڈرپوک ہوتے ہیں اور انسان بھی۔ اسی لئے ڈرپوک لوگوں کو چوہا کہا جاتا ہے۔ انسانوں اور چوہوں میں ایک اور بات مشترک ہے اور وہ یہ کہ انسانوں کی بھی مختلف اقسام ہوتی ہیں اور چوہوں کی بھی۔ ایک اندازے کے مطابق اس وقت دنیا میں چوہوں کی ایک ہزار اقسام پائی جاتی ہیں۔ ان میں چوہوں میں ساٹھ فیصد وہ چوہے ہیں جنہیں "ہرن چوہے" کہا جاتا ہے۔

اگر چہ ان چوہوں کی تعداد بہت زیادہ ہے مگر شاید کم ہی لوگوں نے ان کو دیکھا ہو۔ جنوبی امریکہ میں ہرن چوہے آبادی سے دور جنگلات اور صحراؤں میں رہتے ہیں۔ ہرن چوہوں کو ہرن چوہے اس لئے کہا جاتا ہے کہ ان کا رنگ سفید دم والے ہرنوں سے ملتا جلتا ہوتا ہے۔

اگر چہ یہ چوہے عام طور پر بلوں میں رہتے ہیں لیکن یہ پہاڑوں میں موجود ریخوں اور چڑیوں کے خالی گھونسلوں وغیرہ میں بھی گھر بنا لیتے ہیں۔ اپنے رہنے کی جگہ تلاش کرنے کے بعد یہ چوہے درختوں کی سوکھی پتیاں، پرندوں کے پر اور اسی طرح کی بہت سی چیزوں کو جمع کرتے ہیں اور پھر ان کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں چبا کر نرم بنا لیتے ہیں۔ اور اپنے گھر میں بچھا لیتے ہیں۔

جنوبی امریکہ میں یہ چوہے اس وقت سے آباد ہیں جب جنوبی امریکہ میں یورپ کے لوگ ہجرت کر کے آباد نہیں ہوئے تھے۔ اب ان چوہوں کی تعداد اتنی ہو چکی ہے کہ یہ امریکہ سے کینیڈا تک تقریباً ہر جگہ پائے جاتے ہیں۔

جس طرح معصوم لوگوں کے بہت سے دشمن ہوتے ہیں اسی طرح ان معصوم چوہوں کے بھی بہت سے دشمن ہوتے ہیں۔ بہت سے بڑے پرندے اور خاص طور پر الو صاحب تو ان کے بڑے ہی دشمن ہیں۔ دشمنوں کے خطرے کے پیش نظر یہ بڑی احتیاط کے ساتھ اپنے بلوں سے باہر آتے ہیں۔

ان چوہوں کی اتنی ساری باتیں ہیں کہ اگر ہم آپ کو سنانے لگیں تو کئی دن اور کئی راتیں گزر جائیں بہت سی باتیں پھر کبھی سہی

سورج غروب ہوتے ہی بل سے نکل پڑے

پرائے آشیانے میں اپنے بچوں کے ساتھ

اس سے پہلے پکڑے جائیں، کُتر کُتر کھا جائیں

ایک مورچہ بند چوہا

ایک اُلّو نے آلیا آخر

امانت

طاہر مسعود

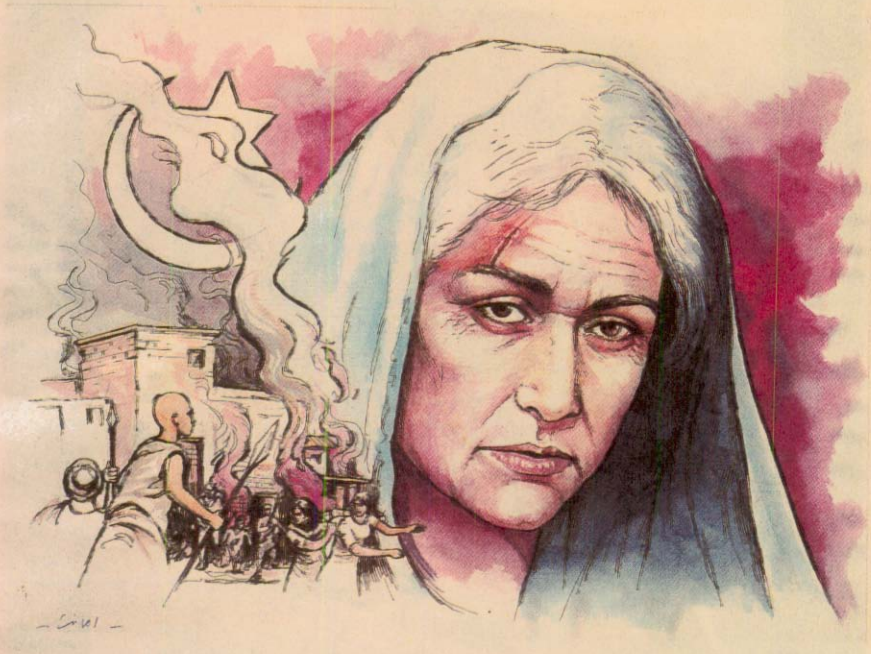

آمنہ بوا کی شخصیت کتنی من موہنی تھی۔ یہ بتانے کے لئے شاید مجھے رک کر الفاظ تلاش کرنے پڑیں۔ لیکن شاید ہی کوئی ایسا لفظ ہو جس میں ان کی شخصیت کی تمام خوبیاں یکجا ہو سکیں۔ اس لئے جب بھی میں انہیں یاد کرتا ہوں تو اس کے لئے میں لفظوں کا سہارا نہیں لیتا۔ بس آنکھیں بند کر لیتا ہوں اور وہ سامنے آ کھڑی ہوتی ہیں۔ وہی سفید بال، پرتقدس چہرہ، عینک سے جھانکتی ہوئی آنکھیں..... اور ہاں سب سے قیمتی ان کا دل..... میں نے اپنی زندگی میں اتنا خوبصورت دل کسی اور کے پاس نہیں دیکھا۔ اس دل میں محبت ہی محبت تھی۔ ہر ایک کے لئے۔ وہ ہمارے گھر میں ایک فرد کی طرح تھیں۔ ہم سب انہیں بچپن سے دیکھتے آئے تھے۔ اور پھر بھی ہمیں ایک زمانے تک معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ کون ہیں؟ کہاں سے آئی ہیں؟ اور ہماری کیا لگتی ہیں؟ یہ جاننے کی ہمیں ضرورت بھی نہیں تھی۔ ہم سارے بھائی بہن ان ہی کی گود میں پروان چڑھے تھے۔ ان کی شفقت بھری تربیت نے ہمیں برے بھلے کی تمیز سکھائی تھی اور ہم نے یہ جانا تھا کہ حالات کیسے ہی ہوں آدمی کو کبھی مایوس نہیں ہونا چاہئے۔

آمنہ بوا پر گھر کی اچھی خاصی ذمہ داریاں تھیں۔ باورچی خانہ وہ سنبھالتی تھیں۔ گھر کی صفائی کا کام ان کے ذمہ تھا۔ ہم سب کی ضروریات کا وہ خیال رکھتی تھیں۔ ان ہی کی وجہ سے امی جان گھر کے معاملات سے تقریباً بے نیاز ہوچکی تھیں۔ ابا جان کو بھی جب کوئی ہدایت دینی ہوتی تو وہ آمنہ بوا ہی کو آواز دیتے تھے۔ میں سوچتا اتنے کاموں کے بعد جب وہ رات گئے بستر پر پہنچتی ہوں گی تو تھک کر نڈھال ہوجاتی ہوں گی۔ لیکن کئی بار آدھی رات گزر جانے کے بعد بھی میں نے ان کے کمرے کی بتی کو جلتے ہوئے پایا اور ایک مرتبہ جب میں اپنے جذبۂ تجسّس کے ہاتھوں مجبور ہو کر یہ دیکھنے گیا کہ وہ ابھی تک سوئی کیوں نہیں ہیں تو میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ مصلا بچھائے عبادت میں مصروف ہیں۔ اور ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے آسمانی نور نے ان کے گرد ہالہ سا بن رکھا ہے۔ وہ خدا کی نہایت صابر و شاکر بندی تھیں۔ کبھی کوئی حرف شکایت زبان پر نہ لانے والی۔

ہاں میں یہ تو بتانا بھول ہی گیا کہ آمنہ بوا کے ماتھے پر زخم کا ایک نشان تھا۔ ایک گہرا نشان جو چمکتا رہتا تھا۔ اس نشان کو ہم اتنے عرصے سے دیکھتے آئے تھے کہ کبھی اس کے بارے میں ہمارے ذہن میں کوئی تجسّس پیدا نہیں ہوا اور ہم نے ان سے یہ پوچھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ آخر یہ زخم انہیں کیسے لگا۔ ہمیں کیا معلوم اس زخم کے پیچھے ان کی زندگی کی المناک کہانی پوشیدہ ہے۔ لیکن اس کہانی کو سنانے سے پہلے میں آمنہ بوا کی شخصیت کے کچھ اور پہلوؤں کا تذکرہ کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ آمنہ بوا میں جنون کی حد تک صفائی پسندی تھی۔ انہیں گندے کپڑے، گندے گھر اور گندی چیزوں سے سخت نفرت تھی۔ حالانکہ ان کے محبت بھرے دل میں نفرت کی گنجائش کہاں تھی۔ اس بات کو یوں کہا جائے تو بہتر ہو گا کہ وہ گندگی برداشت نہیں کر سکتی تھیں۔

اور یہ ان ہی کی تربیت کا اثر تھا کہ ہم سب بھائی بہنوں کی زندگی میں سلیقہ اور صفائی کی عادات پیدا ہوگئی تھیں۔ انہوں نے پورے گھر کو آئینہ بنا دیا تھا۔ ابا کہتے بھی تھے۔ "آمنہ بوا! آپ کی صفائی پسندی سے تو کبھی کبھی جی اوبنے لگتا ہے۔"

"میاں صاحب!" وہ جواب میں کہتی تھیں۔ "جہاں صفائی نہ ہو وہاں رحمت کے فرشتے نہیں آتے۔"

سارے گھر کے کام کاج کے بعد وہ غسل خانے میں کم سے کم آدھے گھنٹے تک اپنے ہاتھ پیر دھوتی رہتیں اور جب انہیں یقین ہو جاتا کہ اب وہ بالکل پاک صاف ہوچکی ہیں تب کہیں جا کے وہ وضو کر کے نماز کے لئے کھڑی ہوتی تھیں۔

آمنہ بوا کو سیاست سے بھی بڑی دلچسپی تھی۔ تھوڑی بہت پڑھی لکھی تو وہ تھیں، اخبار پابندی سے

پڑھتی تھیں اور اتنی تفصیل سے پڑھتی تھیں جیسے حفظ کر رہی ہوں۔ انہیں تازہ ترین سیاسی صورتحال پر گفتگو کا بھی شوق تھا اور وہ اپنی معلومات میں اضافے کے لئے کچھ نہ کچھ پوچھتی بھی رہتی تھیں۔ یہ تو بہت بعد میں جاکر معلوم ہوا کہ سیاست اور ملکی معاملات سے ان کی دلچسپی محض وقت گزاری کی حد تک نہ تھی۔ ملک میں جب بھی ہنگامے، فساد، کرفیو وغیرہ کا سلسلہ شروع ہوتا تو وہ شدید مضطرب اور پریشان ہو جاتی تھیں۔ گم سم سی رہنے لگتی تھیں۔ ہم لوگ سمجھتے تھے کہ آمنہ بوا کمزور دل کی ہیں، ڈر جاتی ہیں۔ اس لئے مذاق میں ہم کہتے بھی تھے۔

"بوا..... آپ خواہ مخواہ پریشان ہو رہی ہیں۔ آپ کو کچھ نہیں ہو گا۔"

"میں اپنے لئے کب پریشان ہوں بیٹا۔" وہ کہتیں اور پھر چپ ہو جاتیں۔

لیکن صاحب ظاہر ہو جاتا تھا کہ وہ اندر سے بے چین ہیں۔ ان کی بے چینی کا سبب نہ معلوم ہونے کی وجہ سے ہم یہی سمجھتے تھے کہ بوا کو ہنگاموں سے ڈر لگتا ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے، میں کالج کے آخری سال میں تھا۔ حکومت نئی نئی بدلی تھی۔ کالج میں چھٹی تھی۔ میں صبح سویرے اخبار پڑھ رہا تھا۔ آمنہ بوا میرے پاس آکر بیٹھ گئیں۔

"کیوں بوا۔ خیریت تو ہے؟" میں نے اخبار پر سے نظر ہٹاتے ہوئے کہا۔

"اللہ کا کرم ہے بیٹا۔" انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔ تھوڑی دیر چپ رہنے کے بعد انہوں نے پوچھا۔ "بیٹا! یہ نئی حکومت کیسی ہے؟"

حکومتیں تو ساری ایک ہی جیسی ہوتی ہیں بوا۔ اب دیکھئے یہ نئی حکومت کیا کرتی ہے۔" میں نے جواب دیا۔

کوئی اچھی حکومت کیوں نہیں آتی بیٹا جو ملک کا خیال رکھے، اس کو ترقی دے۔ لوگ اس سے خوش ہوں۔" بوا نے بڑے سلیقے سے کہا۔

حکومت تو ہم لوگوں ہی سے بنتی ہے نا بوا۔ ہم لوگ اچھے ہو جائیں تو حکومت بھی اچھی ہو جائے گی۔" میں نے کہا۔

یہ سن کر بوا چپ ہو گئیں جیسے یہ بات ان کے دل کو لگی ہو۔

"ہم لوگ پہلے تو ایسے نہ تھے بیٹا۔ اب خدا جانے کیا ہو گیا ہے۔ کیسی نفسانفسی ہے۔" انہوں نے کہا۔ بڑے بوڑھے عام طور پر ایسی ہی باتیں کیا کرتے ہیں۔ اس لئے میں نے ان کی بات پر زیادہ توجہ نہ دی اور اخبار پڑھتا رہا۔ پڑھتے پڑھتے بغیر کسی ارادے کے میری نگاہ آمنہ بوا کی طرف چلی گئی۔ وہ کسی سوچ میں گم تھیں۔ میں نے دیکھا ان کے ماتھے پر زخم کا نشان چمک رہا ہے۔

"بوا..... یہ آپ کے ماتھے پر زخم کا نشان کیسا ہے؟" میں نے پوچھ لیا۔

"گنڈاسے کا نشان ہے بیٹا" انہوں نے مختصراً جواب دیا۔

"گنڈاسے کا؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"ہاں ..... ہندو بلوائیوں نے مارا تھا۔"

"پاکستان جو بن گیا تھا۔ جیسے ہی پاکستان بننے کی خبر پھیلی ہندو بلوائیوں نے ہمارے گاؤں پر حملہ کر دیا۔" بوا بولتے بولتے رک گئیں۔

"پھر؟" میں نے تجسس سے سوال کیا

"پھر میرے دونوں بیٹوں کو اور ان کے باپ کو انہوں نے شہید کر دیا۔ اپنے خیال میں تو ظالموں نے مجھے بھی مار ڈالا تھا لیکن خدا کی قدرت سے میں بچ گئی۔"

آمنہ بوا بول رہی تھیں اور میں حیرت اور افسوس سے ان کا منہ تک رہا تھا۔ بچپن سے آج تک مجھے علم ہی نہیں ہوا تھا کہ بوا کی زندگی کے پیچھے اتنا بڑا سانحہ پوشیدہ ہے۔

"کتنے بڑے تھے آپ کے بیٹے؟" میں نے پوچھا

"بڑا بیٹا نعیم تم سے بس ایک سال چھوٹا ہو گا۔ بالکل تمہارے جیسا تھا۔ قائداعظم کی تصویر اٹھائے سارے گاؤں میں گھومتا پھرتا تھا۔ اپنے ساتھ اور بھی لڑکوں کو ملا لیتا اور پھر سب نعرے لگاتے تھے "بن کے رہے گا پاکستان۔ بٹ کے رہے گا ہندوستان" اسی وقت سے ہندوؤں کی آنکھوں میں نفرت آگئی تھی۔ ایسا گھور کے دیکھتے تھے کہ کچا ہی چبا جائیں گے۔ مجھے تب ان باتوں کا زیادہ پتا نہیں تھا۔ ایک دن جب نعیم دوپہر کو بھی غائب رہا، شام کو بھی اور رات کو لوٹا تو میں نے اسے خوب ڈانٹا۔ میں نے کہا "تو آوارہ ہو گیا ہے۔ کہاں رہا سارا دن۔ بتا ورنہ چمڑی ادھیڑ دوں گی۔" کہنے لگا۔ "اماں..... مسلم لیگ کا جلسہ تھا۔ شہر گیا تھا۔ وہاں قائداعظم آئے تھے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے انہیں دیکھا۔" مارے خوشی کے اس کی زبان سے لفظ نہیں نکل رہے تھے۔ یہ سن کر مجھے بھی دلچسپی ہوئی۔

پوچھا "کیسے لگے وہ؟" بولا۔ "اماں۔ ہمارے قائد چٹان ہیں چٹان۔ انگریزی میں تقریر کی۔ میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آیا۔ لیکن آواز سن کر ایسا لگتا تھا۔ جیسے کسی دیوار میں سے آواز آرہی ہو۔ ہمارے قائد کو کوئی ہلا نہیں سکتا ہے اماں۔ بس اس قسم کی باتیں کرتا رہا۔ اس کی بعد میں نے اسے کبھی نہیں روکا۔ اس کے ابا پوسٹ آفس میں کام کرتے تھے۔ ایک دن کھانے پر میں نے پوچھا۔

"نعیم کے ابا کیا کہتے ہو پاکستان بن جائے گا۔" وہ تو کیا جواب دیتے نعیم بول پڑا۔ "کیوں نہیں اماں۔ ضرور بنے گا۔

"مگر یہ پاکستان بنے گا کہاں پر؟" میں نے پوچھا۔

"جہاں جہاں مسلمان ہندوؤں سے زیادہ ہوں گے۔" نعیم کے ابا بولے

"میں نے کہا "مگر ہمارے گاؤں میں تو ہندو زیادہ ہیں۔ پھر یہاں تو پاکستان نہیں بنے گا۔" نعیم نے تڑپ کر کہا۔ "نہ بنے۔ جہاں بھی پاکستان بنا۔ ہم وہاں چلے جائیں گے۔" اس کی بات مجھے عجیب سی لگی۔ میں نے کہا۔ "اپنے گاؤں کو چھوڑ کر۔ یہاں تو ہمارے پرکھوں کی ہڈیاں دبی ہوئی ہیں۔ اس کو چھوڑ کر ہم کیسے جاسکتے ہیں۔" نعیم بولا۔ "کیوں نہیں جاسکتے۔ ہڈیاں تو مٹی میں مل کر مٹی ہو گئی ہوں گی۔ ہمیں یہاں نہیں رہنا۔ ہم تو اپنے ملک میں جائیں گے۔ اپنے ملک پاکستان میں۔"

آمنہ بوا بولے جارہی تھیں جیسے منہ زور دریا کا بند ٹوٹ گیا ہو۔ اور میں مبہوت ہو کر سن رہا تھا۔

"اس بات پر گھر میں کئی روز تک جھگڑا ہوتا رہا۔ بیٹا! اپنی تو سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ جس گاؤں میں، آنکھ کھولی تھی۔ جہاں پلی بڑھی تھی، اس کو چھوڑ کر ایک ایسی جگہ جانا جس کو اپنی آنکھوں سے دیکھا بھی نہیں تھا ، کون سی عقل کی بات تھی۔ لیکن بیٹے کے سامنے میری کہاں چلتی۔ ابھی یہ بحث ہو رہی تھی کہ پاکستان بننے کا اعلان ہو گیا۔ ہندو تو پہلے ہی بھرے بیٹھے تھے۔ اعلان ہونا تھا کہ خبر گرم ہونے لگی کہ حملہ ہونے والا ہے، ہندو چن چن کر مسلمانوں کو مار ڈالیں گے۔ نعیم نے گھر کی چھت پر خوب سارا اینٹ پتھر جمع کر لیا۔ جس دن حملہ ہوا۔ دونوں باپ بیٹے چھت پر چڑھ کر بلوائیوں پر پتھر پھینکتے رہے۔ لیکن بلوائیوں کا سیلاب ان پتھروں سے بھلا رکنے والا تھا۔ مسلمانوں نے مقابلہ کیا۔ جب یقین ہو گیا کہ بلوائیوں کو نہیں روکا جاسکتا تو عورتوں نے کنوئیں میں چھلانگیں لگانی شروع کر دیں۔"

آمنہ بوا کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ ان کی آواز بدل گئی۔

"بیٹا! نعیم آخری وقت تک لڑا۔ وہ اپنے پتھروں سے بلوائیوں کو روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ پتھر پھینکتے پھینکتے نیچے اترتا، گھڑے سے پانی پیتا اور میرے گلے لگ جاتا۔ "اماں، ڈرنا مت اماں، میں ابھی زندہ ہوں۔" وہ کہتا تھا اور پھر چھت پر چڑھ جاتا تھا۔

"دوپہر ہوتے ہوتے بلوائی گاؤں کے اندر گھس آئے۔ جمیل میری گود میں تھا۔ نعیم کی پیدائش کے بہت دنوں بعد بڑی منتوں سے ہوا تھا۔ بلوائیوں نے جب میرے گھر کا دروازہ توڑا تو نعیم اور اس کے ابا دونوں چھت پر تھے۔ ایک بوڑھے بلوائی نے اندر گھستے ہی گنڈاسا میرے سر پر مارا۔ اس کے بعد مجھے کچھ ہوش نہیں رہا۔ جب ہوش آیا تو میں کہیں اور تھی۔ ظالموں نے سب کو شہید کر دیا تھا۔ مہاجرین کے قافلے کے ساتھ میں بھی پاکستان آگئی۔ حالات جب ذرا سدھرے تو گھروں میں کام کاج شروع کر

دیا۔ اور ہوتے ہواتے تمہارے گھر آ گئی۔ سو آج تک یہیں ہوں۔"

"آمنہ بوا چپ ہو گئیں۔ پوچھے بغیر انہوں نے ایک ایسی داستان سنا دی تھی جس سے میں آج تک بے خبر تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ ان سے کیا کہوں؟ تسلی تشفی دوں، ہمدردی کے دو بول کہوں۔ یا کیا کروں۔ میرا سر جھکا ہوا تھا۔

میں نے بات بدلنے کے لئے کہا۔ "بوا تم نئی حکومت کے بارے میں کچھ پوچھ رہی تھیں۔"

"ہاں بیٹا!" بوا نے کہا "میں نئی حکومت کے بارے میں پوچھ رہی تھی۔ اسی حکومت کو اب یہ ملک چلانا ہے۔ اور یہ ملک میرے بیٹے کی امانت ہے۔ خدانخواستہ اسے کچھ ہوا تو میرے بیٹے کی روح کو تکلیف پہنچے گی...... پہنچے گی نا بیٹا!"

بوا کی آواز میرے کانوں میں آئی لیکن میں انہیں دیکھ نہیں سکا کیونکہ میری آنکھیں آنسوؤں سے دھندلا گئی تھیں۔

کورنگی کراچی سے اسماء وقار کا انتخاب

"بیگم صاحبہ" گداگر نے ایک رحم دل خاتون کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ اگر آپ نے آج پانچ روپے نہ دیئے تو مجھے ایک ایسے عمل کی طرف رجوع کرنا پڑے گا جس کے تصور سے میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور جسم کانپنے لگتا ہے۔

خاتون نے پانچ روپے کا نوٹ گداگر کو دیتے ہوئے ازراہ تجسس اس سے پوچھا۔ خدا تم پر رحم کرے، کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ میں نے تمہیں کس حادثے سے بچایا ہے۔؟

گداگر نے شکر و اطمینان کی ایک نگاہ نیک دل خاتون پر ڈالی اور کہا۔ "کام کرنے سے......"

ایک سیاح ایک گائیڈ کے ساتھ چڑیا گھر کی سیر کر رہا تھا کہ وہ ایک ایسے پنجرے کے پاس پہنچا جس میں شیر اور بکری اکھٹے بندھے ہوئے تھے۔

سیاح حیرت کے ساتھ بولا۔ "واہ واہ! پرامن بقائے باہمی کی ایک شاندار مثال، آخر یہ کس طرح ممکن ہے"؟

"اس طرح جناب۔" گائیڈ بولا "کہ ہم ہر روز اس پنجرے میں ایک نئی بکری ڈال دیتے ہیں"

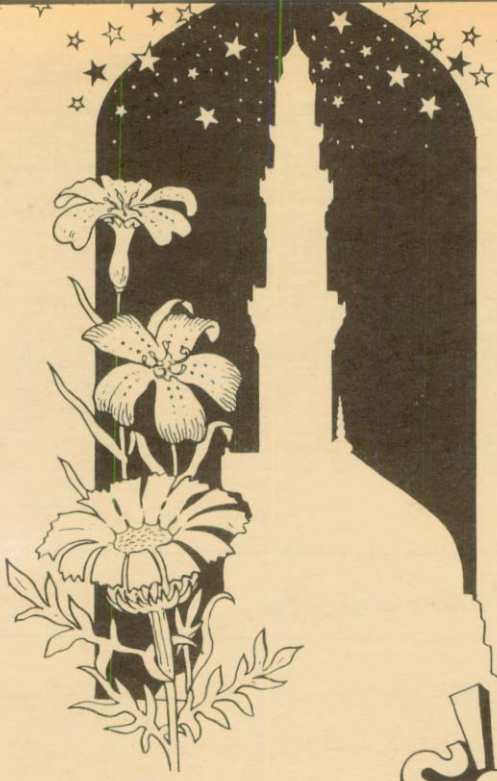

عربی سے ترجمہ
زبیر طارق

حق کی گواہی

عمیر بن وھب بدر کے میدان سے جان بچاکر نکل آئے مگران کا بیٹا وھب مسلمانوں کے ہاتھوں گرفتار ہوگیا۔ اب عمیر ڈر رہے تھے۔ کہیں مسلمان اس نوجوان کو ان جرائم کی سزا نہ دے ڈالیں جو اس کے باپ نے کئے تھے۔ نبی علیہ السلام کو جو شدید اذیتیں دی گئی تھیں اس کا بدلہ ان کے بیٹے سے نہ لیا جائے۔

ایک صبح سورج بلند ہوچکا تھا۔ عمیر کعبہ کا طواف اور وہاں رکھے بتوں سے برکت حاصل کرنے حرم کی جانب چل کھڑے ہوئے۔ حرم پہنچ کر ان کی نظر صفوان بن امیہ پر پڑی۔ وہ حجرِ اسوَد کے ایک جانب بیٹھا تھا۔ عمیر صفوان کے پاس آئے اور کہا،

"صبح بخیر۔ اے قریش کے معزز سردار۔"

"صبح بخیر، وھب کے باپ! آؤ چند گھڑی باتیں کریں..... وقت کاٹنا کتنا دشوار ہو گیا ہے۔"

عمیر صفوان کے پاس بیٹھ گئے۔ جلد ہی بدر کے میدان میں پیش آنے والے المیہ پر گفتگو ہونے لگی۔ اس المناک حادثے کو گزرے زیادہ مدت نہ ہوئی تھی وہ ان قیدیوں کی باتیں کرنے لگے جنہیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے ساتھیوں نے گرفتار کیا تھا۔ قریشی سرداروں کا تذکرہ چھڑتے ہی ان کے دل بھر آئے۔ یہ سردار بدر کے دن مسلمانوں کی تلواروں کا شکار ہوئے اور بدر کے کنوئیں نے انہیں اپنی گہرائی میں چھپا لیا۔

"بخدا! ان لوگوں کے بعد زندہ رہنے میں کوئی بھلائی نہیں۔" صفوان نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔

"اللہ کی قسم تم نے سچ کہا۔" عمیر یہ کہہ کر تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہو گئے۔ پھر بولے!

"ربِ کعبہ کی قسم! اگر مجھے لوگوں کے قرض اور اپنے بیوی بچوں کی بربادی کا فکر نہ ہوتا تو میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو قتل کر کے اس سارے معاملے کی جڑ کاٹ دیتا۔" اتنا کہنے کے بعد انہوں نے آواز دھیمی کر لی اور بولے:

"میرا بیٹا وھب ان کے پاس ہے۔ میرے یثرب جانے پر کسی کو شبہ نہیں ہو سکتا۔"

عمیر نے گویا صفوان کے دل کی بات کہہ دی۔ وہ فوراً عمیر کی جانب متوجہ ہوا اور کہا:

"عمیر! تم قرض کی فکر مت کرو۔ تمہارا سارا قرض میرے ذمے رہا۔ اب اسے میں ادا کروں گا۔ رہا تمہارے بیوی بچوں کا معاملہ انہیں میں اپنے خاندان کے ساتھ رکھوں گا..... تم جانتے ہو، میرے پاس مال و دولت کی کمی نہیں۔ وہ میرے پاس ایک بہترین آسودہ زندگی بسر کریں گے۔"

"ٹھیک ہے مگر یہ بات پوشیدہ رہنی چاہئے۔ کسی تیسرے فرد کو ہرگز خبر نہ ہو۔" عمیر نے کہا۔

"ایسا ہی ہو گا۔" صفوان نے جواب دیا۔

عمیر حرم سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کے دل میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف نفرت کے شعلے بھڑک رہے تھے۔ وہ اپنا عزم پورا کرنے کی تیاریوں میں لگ گئے۔ ان کو خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہ

تھی۔ ان دنوں قریش کے لوگ اپنے قیدیوں کے سلسلے میں اکثر یثرب آجارہے تھے۔ ان کے سفر پر شک نہیں کیا جاسکتا تھا۔

عمیر بن وھب کے حکم پر ان کی تلوار تیز کر کے زہر میں ڈبو دی گئی۔ پھر ان کی سواری کا بندوبست ہوا اور وہ مدینہ منورہ روانہ ہوگئے۔ مدینہ پہنچ کر انہوں نے مسجد نبوی کا رخ کیا، مسجد کے دروازے کے قریب اپنا اونٹ زمین پر بٹھایا اور نیچے اتر آئے۔

حضرت عمرؓ بن خطاب چند اور صحابہ کے ہمراہ مسجد کے دروازے کے قریب بیٹھے تھے۔ یہاں بھی موضوعِ گفتگو معرکۂ بدر تھا۔ بدر کے بعد نمودار ہونے والی صورت حال، اسیران قریش اور ان کے مقتولین کی باتیں زیرِ بحث تھیں۔ مہاجرین وانصار کی بہادری کی داستانیں بیان کی جارہی تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو جس طرح اپنے فضل اور مدد سے نوازا اور ان کے دشمنوں کو جس کُشت وخون اور شکست کا سامنا کرنا پڑا، اس کا تذکرہ ہورہا تھا۔ اچانک حضرت عمرؓ کی نظر عمیر بن وھب پر پڑی۔ وہ اپنی سواری سے نیچے اتر کر مسجد کی جانب آرہے تھے۔ ان کی تلوار ان کے گلے میں لٹک رہی تھی۔ حضرت عمرؓ جیسے کسی خوف سے اچانک چونک کر بولے۔

"یہ دشمنِ خدا عمیر بن وھب ہے..... واللہ اس کی نیت میں ضرور کھوٹ ہے۔ مشرکینِ مکہ نے اسے ہمارے خلاف بھڑکا کر بھیجا ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے بدر میں یہ ہمارے خلاف جاسوسی کرتا رہا ہے۔"

پھر وہ مجلس کے ساتھیوں سے مخاطب ہوئے: "ہمیں فوراً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچنا چاہئے۔ تم رسول اللہ کے گرد حصار باندھ لو۔ خوب چوکنے رہو۔ کہیں یہ فریبی آپؐ کو دھوکا نہ دے۔"

حضرت عمرؓ جلدی سے نبی علیہ السلام کے پاس پہنچے اور فرمایا: اللہ کے رسول! دشمن خدا عمیر بن وھب گلے میں تلوار لٹکائے آرہا ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ اس کی نیت برائی کے سوا کچھ اور ہے۔"

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اسے میرے پاس آنے دو۔"

حضرت عمر فاروقؓ عمیر بن وھب کی جانب لپکے اور انہیں گریبان سے پکڑ لیا۔ پھر ان کی تلوار کا پٹا ان کی گردن کے گرد کس دیا اور اسی حالت میں انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے آئے۔ حضور نے دیکھا تو فرمایا: "عمر! اسے چھوڑ دو۔" حضرت عمرؓ نے انہیں چھوڑ دیا۔ پھر آپؐ کے حکم پر ان سے کچھ ہٹ گئے۔ اس کے بعد رسول اکرمؐ نے عمیر کو قریب آنے کو کہا۔ عمیر آپ کے قریب آئے اور

عربوں کے جاہل الفاظ میں دعا کے طور پر صبح بخیر کہا۔

"عمیر! اللہ نے ہمیں تمہاری دعا سے کہیں بہتر دعا عطا فرمائی ہے..... اللہ نے ہمیں سلام سے نوازا ہے اور یہ اہل جنت کی دعا ہے۔" نبیؐ نے عمیر کو جواب دیا۔

"بہرحال ہم آپ کو اپنا ہی سلام کریں گے اور یہ آپ کے لئے دوستی کا پیغام ہے۔"

"کہو عمیر کیونکر آنا ہوا؟"

"میں اس قیدی کے لئے آیا ہوں جو آپ کے پاس ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ اسے لوٹا کر مجھ پر احسان فرمائیں۔"

"یہ تم نے اپنے گلے میں تلوار کیوں لٹکا رکھی ہے؟"

"اللہ ان تلواروں کا بُرا کرے۔ انہوں نے بدر کے دن آپ کا کیا بگاڑ لیا؟"

"عمیر! مجھے سچ بتاؤ تم کس لئے آئے ہو؟

کیا تم حجرِ اسود کے قریب صفوان بن امیہ کے ہمراہ نہیں بیٹھے تھے۔ تم دونوں نے قریش کے ان مقتولین کی باتیں کیں جنہیں ہم نے بدر کے دن کنوئیں میں ڈال کر دفن کیا تھا۔ پھر تم نے کہا۔ اگر مجھ پر قرض اور بال بچوں کی ذمہ داری نہ ہوتی تو محمد کو قتل کر آتا۔ صفوان بن امیہ نے تمہارے قرض اور بال بچوں کی ذمہ داری اٹھائی ہے تاکہ تم مجھے قتل کر دو....."

یہ بات سن کر عمیر ایک لمحے کے لئے ہکا بکا رہ گئے۔ پھر فوراً بولے "میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔" اس کے بعد عمیرؓ گویا ہوئے۔ "اے اللہ کے رسول! آپ آسمانوں کی خبریں اور وحی کے ذریعے آپ پر جو کچھ نازل ہوتا، ہمیں بتاتے تھے مگر ہم جھٹلا دیا کرتے۔ لیکن صفوان کے ساتھ میری اس گفتگو کی خبر اس کے یا میرے سوا کوئی نہیں جانتا..... واللہ یہ خبر ضرور آپ کو اللہ نے دی ہے..... میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں جو مجھے آپ کے پاس لایا تاکہ میں اسلام کی ہدایت پاؤں۔" اس کے بعد عمیرؓ نے کلمہ پڑھا اور مسلمان ہوگئے۔

نبی علیہ السلام نے اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہو کر فرمایا! "اپنے بھائی کو دین کی تعلیم دو، اسے قرآن سکھاؤ اور اس کے قیدی کو آزاد کر دو۔"

عمیر بن وھبؓ کے اسلام قبول کرنے پر مسلمان نہایت خوش ہوئے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ "عمیر بن وھب نے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف جسارت کی تو مجھے خنزیر اس سے زیادہ پسند

تھا مگر آج وہ مجھے اپنے بیٹوں سے بھی زیادہ محبوب ہے۔"

اب عمیر اپنے نفس کو اسلامی تعلیمات سے پاک کرنے میں مصروف ہوگئے۔ وہ اپنے دل کو قرآن کے نور سے بھر رہے تھے۔ وہ زندگی کے ان دنوں کی تلافی کر رہے تھے جنہیں مکہ کے لوگوں اور وہاں کی مصروفیات نے ضائع کر دیا تھا۔

ادھر صفوان بن امیہ اپنے آپ کو تسلی دے رہا تھا۔ وہ قریش کی مجلسوں سے گزرتا تو کہتا! "خوش ہو جاؤ! جلد ہی ایک بڑی خبر آنے والی ہے، ایسی خبر جس سے تم بدر کے واقعہ کو بھول جاؤ گے۔"

پھر صفوان کا انتظار طویل ہونے لگا۔ آہستہ آہستہ وہ بے چین و بے قرار رہنے لگا۔ اس کا یہ اضطراب بڑھتا گیا۔ اب اسے کسی پہلو چین نہ آتا۔ اس نے آتے جاتے مسافروں سے عمیر کے بارے میں پوچھنا شروع کر دیا۔ مگر اسے کوئی جواب نہ ملا جس سے اس کی امید بر آتی۔ بالآخر ایک سوار اس کے پاس آیا اور کہا۔ "عمیر مسلمان ہوگیا ہے۔" اس خبر کا سننا تھا کہ صفوان پر گویا بجلی آگری ..... وہ سمجھتا تھا دنیا بھر کے لوگ مسلمان ہو جائیں مگر عمیر بن وھب اسلام قبول نہیں کر سکتا۔

عمیرؓ دین کو سمجھنے اور قرآن یاد کرنے میں لگے رہے۔ ایک دن انہوں نے نبی علیہ السلام کی خدمت میں عرض کی۔

"اے اللہ کے رسولؐ! میں ایک طویل مدت تک اللہ کا نور بجھانے میں دن رات مصروف رہا۔ میں نے اسلام قبول کرنے والوں کو شدید اذیتیں دیں۔ میں چاہتا ہوں آپ اجازت دیں تو مکہ جاؤں اور قریش کو اللہ اور اس کے رسول کی جانب دعوت دوں۔ اگر وہ قبول کرلیں تو کیا ہی اچھا، اور اگر انکار کریں تو انہیں ان کے دین کے لئے اسی طرح اذیت دوں جیسے آپ کے ساتھیوں کو دیا کرتا تھا۔"

حضورؐ نے اجازت دی وہ اچانک مکہ پہنچ کر صفوان بن امیہ کے گھر آئے اور کہا۔

"اے صفوان! تم مکہ کے سرداروں میں سے ہو اور تمہارا شمار قریش کے عقلمند لوگوں میں ہوتا ہے۔ کیا تمہیں کبھی خیال آیا کہ تم لوگ جس طرح پتھروں کو پوجتے ہو ان کے لئے قربانیاں کرتے ہو، ایک درست عقل انہیں دین تسلیم نہیں کرتی۔ جہاں تک میرا معاملہ ہے میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور محمد اللہ کے رسول ہیں۔"

پھر عمیرؓ نے مکہ میں لوگوں کو اللہ کی جانب بلانا شروع کر دیا۔ ان کی محنت پھل لائی اور بے شمار لوگوں نے ان کے ہاتھ پر اسلام قبول کر لیا۔

دادا ابّا کی عینک

سیّد نظر زیدی

گلریز کے دادا ابا صبح کی نماز پڑھ کر سو جاتے تھے اور پھر اُس وقت اٹھتے تھے جب ناشتہ تیار ہو جاتا تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جو دنیا میں بہت کامیابیاں حاصل کرتے ہیں۔ کچھ لوگ تو کامیابی صرف اس بات کو سمجھتے ہیں کہ آدمی ڈھیر ساری دولت اکٹھی کر لے، کوٹھی بنوالے، کار خرید لے۔ بیشک یہ بھی کامیابی ہے، لیکن سچی اور اصل کامیابی یہ ہوتی ہے کہ روپے پیسے کے ساتھ انسان نیک نامی بھی کمائے جو نیک اور اچھا بن کر ہی حاصل کی جاسکتی ہے اور گلریز کے دادا جان نے یہ دوسری دولت بھی بہت کمائی تھی۔ ہر جگہ ان کا نام عزت سے لیا جاتا تھا اور ان کی تعریف کی جاتی تھی۔

دادا ابا کی زندگی اس بڑھاپے میں بھی بہت رکھ رکھاؤ کی تھی۔ وہ ہر کام بالکل ٹھیک وقت پر کرتے تھے اور اپنی ہر چیز اس کی جگہ پر رکھتے تھے۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے چیزوں کو ان کی جگہ پر رکھنے کا یہ فائدہ ہوتا ہے کہ ضرورت پڑنے پر ڈھونڈنی نہیں پڑتیں، ہاتھ بڑھاؤ اور اٹھالو۔ اس طرح ان کے اور سب کاموں میں بہت سلیقہ اور صفائی ستھرائی نظر آتی تھی۔ دادا ابا کی اس بہت صاف ستھری اور پاکیزہ زندگی میں اگر کوئی کمی نظر آتی تھی... وہ یہ تھی کہ وہ کسی قدر چڑچڑے ہوگئے تھے انہیں بالکل معمولی باتوں پر بھی غصہ آجاتا تھا اور جب غصہ آجاتا تھا تو گھر میں خاصی رونق ہو جاتی تھی۔ وہ چیختے چلاّتے تھے۔ دادی اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لئے جواب دیتی تھیں اور پھر سوال جواب کا یہ سلسلہ اس وقت تک چلتا رہتا تھا جب تک گلریز کی امی یا ابو بیچ میں پڑ کر دونوں کی صلح نہ کرا دیتے تھے۔

آج جمعہ کی چھٹی تھی۔ گلریز کسی قدر دیر سے جاگا تھا لیکن دادا ابھی سو رہے تھے۔ اپنے پلنگ سے اُٹھ کر وہ دادا ابا کے کمرے میں آگیا۔ ارادہ یہ تھا کہ ان کی کھانسی کی گولیوں میں سے دو تین گولیاں لے کر دبے پاؤں لوٹ جائے گا۔ یہ میٹھی گولیاں اسے بہت پسند تھیں۔ دادا ابا اپنی خوشی سے نہ دیتے تھے ان کا کہنا تھا یہ دوا ہے اور صرف اس کو کھانی چاہئے جو بیمار ہو۔ادھر گلریز کو یہ خوشبودار میٹھی گولیاں چیونگم اور ٹافیوں سے اچھی لگتی تھیں۔ چنانچہ وہ موقع پاکر اپنا شوق پورا کر لیا کرتا تھا اور یہ موقع جمعہ کے دن ہی ملتا تھا عام دنوں میں تو اسکول جانے سے پہلے صبح کا سارا وقت امی جان کی نظروں کے سامنے رہنا پڑتا تھا جو سب بچوں کو اسکول جانے کے لئے تیار کرتی تھیں۔

جیسا کہ ہم نے بتایا گلریز کا ارادہ تھا گولیاں اٹھا کر اسی طرح دبے پاؤں باہر نکل جائے گا جس طرح آیا تھا، لیکن نہ جانے کیوں آج اس کے دماغ میں یہ خیال آگھسا کہ دادا ابا اور دادی اماں کی تیز تیز باتوں کا لطف اٹھانا چاہئے اور اس نے دادا جان کے سرہانے سے ان کی عینک اٹھالی۔ یہ کام بالکل آسان تھا لیکن اتفاق ایسا ہوا کہ جیسے ہی اس نے عینک کی طرف ہاتھ بڑھایا ریحانہ آگئی اور گھبراہٹ بھری آواز میں بولی، ''بھائی جان یہ کیا غضب کرنے لگے ہیں آپ؟ معلوم نہیں دادا ابا کو عینک اس کی جگہ نہ ملے گی تو قیامت آجائے گی۔''

گلریز ہونٹوں پر انگلی رکھ کر بولا، ''خاموش! اسی لئے تو یہ کام کر رہا ہوں کتنے دنوں سے گھر پر سناٹا سا چھایا ہوا ہے سب لوگ شرافت سے اپنے اپنے کاموں میں لگے رہتے ہیں بھلا یہ بھی کوئی زندگی ہے، آج دادا ابا کو عینک اس کی جگہ پر نہ ملے گی تو کچھ رونق ہو جائے گی۔''

"لیکن یہ کوئی اچھی بات ہے؟ دادا جان کو پریشان کروگے تو اللہ پاک سخت گناہ دیں گے تمہیں۔" ریحانہ نے سمجھانے کی کوشش کی۔ "دیکھا جائے گا۔" گلریز نے بے پروائی سے کہا اور عینک اٹھا کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

○

گلریز کا اندازہ بالکل ٹھیک نکلا۔ دادا ابا نے عینک اس کی جگہ پر نہ پائی تو شور مچا دیا۔ دادی اماں نے انہیں چپ رہنے کے لئے کچھ کہا اپنی بے گناہی ثابت کرنے کی کوشش کی اور گھر میں اچھا خاصا ہنگامہ مچ گیا بلکہ اس سے بھی آگے آج تو کچھ ایسا ہوا کہ امی اور ابو کے درمیان میں آنے اور سمجھانے سے بھی دادا ابا کا غصہ کم نہ ہوا۔ وہ یہی کہتے رہے کہ مجھے ساری تکلیفیں اس بڑھیا کی بے پروائی کی وجہ سے پہنچتی ہیں۔

ریحانہ کو پوری بات معلوم تھی کہ اس ڈرامے کا اصلی ہیرو کون ہے، بلکہ وہ تو یہ بھی جانتی تھی کہ گلریز نے عینک کہاں چھپائی ہے جب اس نے دیکھا کہ جھگڑا ختم ہی نہیں ہو رہا اور دادا ابا کے چیخنے چلانے سے دادی اماں کی آنکھوں میں آنسو آگئے ہیں تو عینک لے آئی اور دادا ابا کو گلریز کی شرارت کا سارا حال بتا دیا وہ جانتی تھی کہ گلریز بدلہ لے گا لیکن اسے یہ بات ضروری معلوم ہوئی کہ دادا ابا اور دادی اماں کے درمیان جو رنجش پیدا ہو گئی ہے وہ ختم ہو جائے۔

○

گلریز نے جو حرکت کی تھی۔ اسے اس کی سزا ملنی چاہئے تھی سب کا خیال تھا دادا ابا اسے خوب ڈانٹیں گے، لیکن ایسا نہ ہوا، ریحانہ کی بات سن کر وہ کچھ دیر چپ بیٹھے رہے، جیسے سوچ رہے ہوں، پھر پیار بھری آواز میں بولے "گلریز بیٹے، یہاں ہمارے پاس آؤ۔"

گلریز اپنے آپ کو سزا بھگتنے کے لئے تیار کر چکا تھا۔ دادا ابا کی یہ بات سنی تو خوش ہو گیا اور جلدی سے ان کے پاس آگیا دادا ابا نے بہت پیار سے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے اپنے اور قریب کر لیا اور سمجھانے کے انداز میں بولے، "بیٹے آج تم نے جو گناہ کیا ہے پھر کبھی نہ کرنا، پہلی بات تو یہ کہ اللہ پاک نے بڑی عمر کے لوگوں کی عزت کرنے کا حکم دیا ہے پھر ہم تو تمہارے دادا ابا بھی ہیں تمہیں ہماری عزت تو اور بھی زیادہ کرنی چاہئے۔ دوسرے اس قسم کی شرارت کرنے سے کبھی ایسا ہوتا ہے کہ دوسروں کو بہت زیادہ تکلیف پہنچ جاتی ہے اور ان کی بد دعا سے شرارت کرنے والے مصیبت میں پھنس جاتے ہیں۔ آج تم نے یہ شرارت کی تو ہمیں اپنے بچپن کا ایک واقعہ یاد آگیا۔"

"دادا ابا کیا آپ نے بھی کسی کے ساتھ ایسی ہی شرارت کی تھی؟"

گلریز نے سوال کیا۔

"ہاں بیٹے۔" دادا ابا نے کہا، "جب ہم تمہاری عمر کے تھے ہم نے بالکل اسی طرح اپنی خالہ اماں کی عینک چھپادی تھی اور ہماری شرارت سے انہیں بہت زیادہ تکلیف پہنچی تھی۔ ہماری یہ خالہ اماں بہت بوڑھی تھیں۔ ان کے خاوند کا انتقال ہوگیا تھا کوئی اولاد بھی نہ تھی اس لئے وہ ہمارے گھر آگئی تھیں۔ سب ان کی بہت عزت کرتے تھے، لیکن نہ جانے کیوں ایک دن میں نے ان کی عینک چھپادی۔ ان کی نظر بہت کمزور تھی، عینک کے بغیر بالکل پاس رکھی ہوئی چیز بھی نہ دیکھ سکتی تھیں۔ انہوں نے گھر کے ایک ایک آدمی سے اپنی عینک کے بارے میں پوچھا اور سب نے یہی جواب دیا کہ ہمیں معلوم نہیں وہ بتا بھی کس طرح سکتے تھے ٹھیک بات تو بس مجھے معلوم تھی اور میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ بوڑھی خالہ اماں عینک کے بغیر کیا کرتی ہیں۔

"ہائے ہائے دادا ابا یہ تو بڑی بے رحمی کی بات تھی!" ریحانہ نے کہا۔ لگتا تھا یہ بات سن کر اسے بہت رنج ہوا ہے۔

"ہاں بیٹی، بہت بے رحمی کی، لیکن اس وقت تو ہمیں یوں لگ رہا تھا کہ ہم نے بہت شاندار کام کیا ہے۔ دراصل بچپن کی عمر ایسی ہی ہوتی ہے بچے کے ہاتھوں اور پیروں کی طرح اس کی عقل بھی چھوٹی اور کمزور ہوتی ہے اور اسی لئے یہ بات ضروری ہے کہ بچے اپنے بڑوں کا کہنا مانیں جن کاموں کے کرنے کے لئے کہیں وہ کریں اور جن سے روکیں رک جائیں۔"

"بیشک یہ بات بہت ضروری ہے۔" ریحانہ نے کہا "جس طرح چھوٹے بچے کوئی بھاری چیز نہیں اٹھا سکتے اور نہ اپنے خرچ پورے کرنے کے لئے روپیہ کما سکتے ہیں، بالکل اسی طرح سب باتوں کے بارے میں یہ نہیں جان سکتے کہ کون سی اچھی ہے اور کون سی اچھی نہیں ہے۔"

"ہاں یہ بات تو ہے۔" گلریز نے اپنی عادت کے خلاف ریحانہ کی بات کو ٹھیک مان لیا۔ پھر دادا ابا کی طرف دیکھ کر بولا "اچھا تو اس کے بعد کیا ہوا دادا ابا؟"

"اس کے بعد یہ ہوا بیٹے کہ خالہ اماں کسی ضرورت سے اٹھیں تو میز سے ٹکرا کر گر پڑیں ان کے ماتھے سے خون بہنے لگا اور وہ بیہوش ہوگئیں میں ان کی گھبراہٹ کا تماشہ دیکھنے کے لئے دروازے میں کھڑا تھا۔ وہ بُری طرح گریں تو گھبرا گیا۔ دوڑ کر ان کے پاس گیا اور انہیں اٹھانے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ بیہوشی کی حالت میں بڑبڑا رہی تھیں۔ "اے اللہ جس نے میری عینک چھپائی ہے اسے برباد کردے، اسے

برباد کر دے۔"

"ہائے اللہ، وہ تو آپ کو کوس رہی تھیں۔" ریحانہ نے کہا وہ دادا ابا کی یہ بات سن کر ڈر گئی تھی دادا ابا افسوس کے انداز میں لمبا سانس لے کر بولے "ہاں بیٹی وہ درد سے کراہتے ہوئے کوسنا ہی دے رہی تھیں اور تم یہ سن کر حیران ہوگی کہ ان کی بد دعا کا اثر دوسرے دن ہی ظاہر ہو گیا۔ ہم اسکول سے واپس آ رہے تھے کہ ایک آدمی نے ہمیں پکڑ لیا اور ایک اندھیری کوٹھڑی میں بند کر دیا۔"

"دادا ابا کیا وہ بچوں کو اغوا کرنے والا کوئی بُرا آدمی تھا؟" گلریز نے پوچھا۔

"ہاں بیٹے ان دنوں پورے شہر میں شور مچا ہوا تھا کہ بچوں کو اغوا کرنے والا کوئی گروہ آ گیا ہے دس بارہ بچے اغوا ہو چکے تھے۔" دادا ابا نے جواب میں بتایا۔

"تو پھر آپ آزاد کیسے ہوئے؟" ریحانہ نے پوچھا۔

"بس یوں سمجھ لو بیٹی اللہ پاک کی خاص رحمت ہی سے ہم اس ظالم کے پنجے سے نکلے۔ جس زمانے کا یہ واقعہ ہے ہماری عمر گیارہ برس تھی۔ ہم فوراً سمجھ گئے کہ بچوں کو اغوا کرنے والوں کے چنگل میں پھنس گئے۔ بہت گھبرائے کوٹھڑی سے باہر نکلنے کی کوشش کی۔ دروازہ زور زور سے ہلایا لیکن کامیابی حاصل نہ ہوئی اور تھک ہار کر رونے لگے اور روتے روتے اللہ سے دعا مانگنے لگے۔ ہم نے اپنے دل میں پکا ارادہ کر لیا کہ اگر اس مصیبت سے بچ گئے تو ساری زندگی خالہ اماں کی خدمت کریں گے انہیں خوش کرنے کی کوشش کرتے رہیں گے۔"

"پھر آپ کی یہ دعا قبول ہو گئی؟ میرا مطلب ہے دعا کی برکت ہی سے آپ کو اس قید سے آزادی مل گئی؟" گلریز نے سوال کیا۔

"ہاں بیٹے! اللہ پاک نے یہ بات قرآن شریف میں بتائی ہے کہ جب کوئی سچے دل سے دعا کرتا ہے تو اس کی دعا قبول ہوتی ہے۔"

"دادا ابا میں نے سنا ہے اگر کوئی جھوٹ بولتا ہو یا دوسروں کی چیزیں چھین لیتا ہو تو اس کی دعا قبول نہیں ہوتی؟"

ریحانہ نے سوال کیا۔

"ہاں بیٹی یہ بات ٹھیک ہے دعا صرف ان لوگوں کی قبول ہوتی ہے جو سچے دل سے یہ وعدہ کرتے ہیں کہ جو غلطی ان سے ہو گئی ہے پھر کبھی نہ کریں گے۔ پاک صاف رہتے ہیں دوسروں کو ستاتے نہیں بلکہ

آرام پہنچاتے ہیں اور جھوٹ نہیں بولتے اور چونکہ ہم نے سچے دل سے توبہ کی تھی اس لئے ہماری دعا اسی وقت قبول ہو گئی ہوا یہ کہ ذرا دیر بعد ہی وہ برا آدمی کھانا لے کر کوٹھڑی میں آیا اور کھانا رکھ کر باہر نکلنے لگا تو پولیس آگئی، پولیس آگئی، کا شور مچ گیا اور وہ ایسا گھبرایا کہ کوٹھڑی کا دروازہ بند کئے بغیر بھاگ گیا۔ "

"اور آپ باہر نکل آئے؟" گلریز بولا۔ لگتا تھا دادا ابا کی بات سن کر اسے بہت خوشی ہوئی ہے۔

"ہاں بیٹے، ہم جلدی سے کوٹھڑی سے باہر آگئے اور خیر خیریت سے اپنے گھر پہنچ گئے اور پھر ساری زندگی ہم نے خالہ اماں کی اس طرح خدمت کی کہ وہ اٹھتے بیٹھتے ہمیں دعائیں دیتی تھیں۔ ہمارا ایمان ہے کہ ہمیں جتنی کامیابیاں حاصل ہوئیں وہ خالہ اماں کی دعاؤں کی وجہ سے ہی حاصل ہوئیں اللہ پاک نے ہمیں بہت بڑا افسر بنایا، تندرست رکھا، خوب عزت دی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ تم جیسے پیارے پیارے بیٹے اور بیٹیاں دیں۔ " دادا نے کہا۔ وہ بہت خوش نظر آرہے تھے۔

دادا ابا کی بات ختم نہ ہوئی تھی کہ ریحانہ نے مسکرا کر گلریز کی طرف دیکھا جیسے پوچھ رہی ہو کہو تمہارا کیا ارادہ ہے؟ پھر کرو گے ایسی شرارت؟ اور اس نے توبہ کرنے کے انداز میں جلدی سے اپنے کانوں کو ہاتھ لگایا۔

جناب کا کتّا

ذیشان آفتاب ...... کراچی

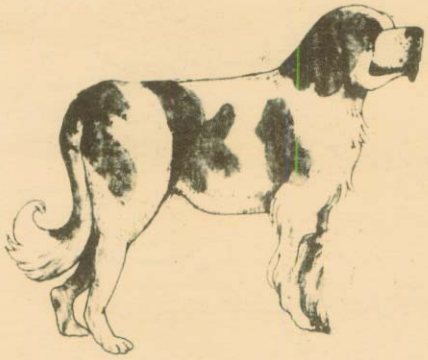

گاہک (دکان دار سے) "آج کے بعد میرا کتّا بھی تمہاری دکان پر آئے تو تمہیں اس کی عزت کرنی ہوگی"۔

دکان دار۔ "بہت بہتر ہے جناب! آج کے بعد آپ کا کتّا آئے تو میں یہی سمجھوں گا کہ جناب ہی تشریف لائے ہیں"۔

یہ "یو ایس اے" کا کُتّا ہے
فضا میں غور سے دیکھیں

فضا میں پھلانگنے
کے چند مناظر

تحریر: اُسامہ بن سلیم

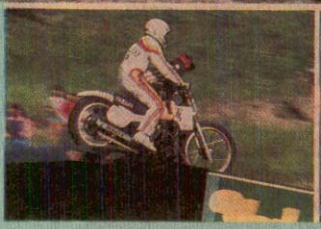

ایک مشہور امریکی رسالے "نیشنل انکوائرر" نے فضا میں جست لگانے والے موٹر سائیکل سوار کے ساتھی کُتّے کو "بے خوف کُتّا" کہہ کر خراجِ تحسین پیش کیا ہے، مگر جب ہم نے کُتّے کی تصویر کو غور سے دیکھا تو پتہ چلا کہ کُتّے کی آنکھوں پر تو اندھا چشمہ لگا ہوا ہے۔ اندھی آنکھوں والا اپنی مرضی کے بغیر کسی کے ساتھ کود بھی جائے تو ہمارے خیال میں اسے "بے خوف" کے بجائے "بے وقوف" کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ ان تصاویر کی تفصیل یہ ہے کہ ایک امریکی شہری ریکس فیلپس نے ایک کُتّے کے ساتھ فضا میں ساٹھ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے جست لگائی اور چودہ کاروں کو کامیابی سے پھلانگ کر زمین پر اُتر آیا۔ بعد میں ریکس اور کُتّے نے اپنے کُتّے کا انعام بھی پایا۔

یوآکری کے تعاقب میں

تحریر:۔ جوزمارسی یو آئرس
تلخیص و ترجمہ:۔ انگرانوار اعوان

اگر آپ دریائے ایمزن کے کنارے واقع قصبہ الواریز (Alvaraes) کے باشندوں کو یو آکری (Uakaris) کی تصویر دکھائیں تو شاید ہی کوئی اس مخلوق کو پہچان سکے۔ ہو سکتا ہے کوئی من چلا بول اٹھے کہ یہ ایشیاء یا افریقہ کا کوئی جانور معلوم ہوتا ہے۔ لیکن ان کو سخت حیرت ہوگی جب آپ ان کو بتائیں گے کہ یہ جانور ان کی بستی سے محض پانچ میل دور واقع ایمزن بن میں بہ افراط پایا جاتا ہے۔ اس جنگل کو ایمزن بن کہنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ چاروں طرف سے دریا کے پانی سے گھرا ہوا ہے اور خشکی کا کوئی راستہ اس کو باقی دنیا سے نہیں ملاتا۔ یہی وجہ ہے کہ ایک عرصہ تک لوگوں کے لئے اس جنگل میں دلچسپی کی کوئی چیز نہ تھی لیکن چند سال پہلے اس میں موجود یو آکرین نسل کے لنگوروں کی دریافت نے آج اس جنگل کو عالمی شہرت عطا کر دی ہے۔

یو آکری (Uakari) کو بعض لوگوں نے "انگریز بندر" (English Monkey) کا نام بھی دیا ہے۔ اس کی وجہ اس کا انگارے کی طرح دھکتا ہوا چہرہ ہے۔ اس لحاظ سے اردو میں ہم اسے گلنار لنگور کہہ سکتے ہیں۔ گلنار لنگور کی کھوپڑی گنجے آدمی کے سر سے مشابہ ہوتی ہے اور دُم حیرت انگیز حد تک مختصر اور موٹی۔ دیگر لنگوروں کی طرح اس کے سامنے کے اوپر کے دانت نیچے کے دانتوں کی نسبت آگے کو نکلے ہوئے ہوتے ہیں اور ناک موٹی اور بھدی ہوتی ہے۔

گلنار لنگور کا بغور مطالعہ کرنے کے لئے ہمیں کئی مقامی لوگوں کی مدد سے پانی کے اندر جانے والا تین فٹ چوڑا اور تقریباً ۳۳ کلو میٹر لمبا ایک راستہ بنانا پڑا۔ جنگل میں جانے کے لئے ہم اپنی چھوٹی سی کشتی میں سوار ہو جاتے اور تقریباً ساڑھے چھ گھنٹے کے بعد مطلوبہ جگہ پہنچ جاتے۔ علاقہ ویران اور سنسان اور عالم یہ کہ دور دور تک آدم نہ آدم زاد۔ اس کی کئی ایک وجوہات تھیں۔ ایک تو علاقہ چاروں طرف سے پانی میں گھرا ہوا تھا اور جنگل کی سرزمین بھی اکثر پانی میں "غائب" رہتی تھی۔ دوسرا یہاں پہنچنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ پھر یہاں موٹے تازے مچھروں کی بہتات تھی جو ایک دفعہ کاٹ لیتے تو دیر تک اس جگہ کو کھجانا اور سہلانا پڑتا تھا۔ ایک اور وجہ پانی کا طوفانی اتار چڑھاؤ بھی ہو سکتی ہے۔ شاید انہی وجوہات کی بنا پر کسی نے آج تک اس طرف کا رخ کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔ ہم سال میں اوسطاً چھ ماہ پانی میں رہتے اور اس دوران لنگوروں کا دبے پاؤں پیچھا کر کے ان کی عادات و خصائل کا مشاہدہ کرتے اور جنگلی پھولوں کے پھل بننے تک کے مراحل کا ہفتہ

وار جائزہ لیتے۔

گلنار لنگوروں کی یہ بستی بڑی عجیب و غریب ہے۔ جب دریا طغیانی پر ہوتا ہے تو درختوں کی چوٹیوں کے سوا باقی تمام حصہ پانی میں ڈوب جاتا ہے۔ ایسے چڑھاؤ اکثر آتے رہتے ہیں۔ چڑھاؤ کے دنوں میں بعض دفعہ ایسی نوبت بھی آجاتی ہے جب گلنار لنگور چھوٹے درخت کی انتہائی چوٹیوں پر ہوتے ہیں اس کے باوجود ان کے سر کے علاوہ باقی دھڑ پانی میں ڈوبا ہوتا ہے۔ اس کے باوجود لنگوروں کی یہ نسل اسی جنگل میں رہتی ہے اور یہیں تک محدود ہے۔ دریائے جاپورا (Japura) اور دریائے ایمزن (Amazon) کے درمیان گھرا ہوا یہ علاقہ آبی جنگل شمار ہوتا ہے۔ ایمزن بن سال میں چھ مہینے تک پانی میں ڈوبا رہتا ہے جس کی ایک وجہ یہاں ہونے والی موسلا دھار بارشیں بھی ہیں مارچ اور اگست کے درمیان پانی اتنا چڑھا ہوا ہوتا ہے کہ درختوں کا ساٹھ فٹ سے بھی زیادہ حصہ پانی میں ڈوبا ہوا ہوتا ہے اور بعض درختوں کی چوٹیاں پانی کی سطح پر جھاڑیوں کی طرح دکھائی دیتی ہیں۔

گلنار لنگور پچاس پچاس کی ٹولیوں میں رہتے ہیں جنہیں ہم "جھنڈ" کہہ کر پکارتے تھے۔ جھنڈ میں نر اور مادہ دونوں قسم کے لنگور ہوتے ہیں۔ رات کے وقت جھنڈ زیادہ سے زیادہ ۱۳۰ فٹ کی بلندی پر چلے جاتے ہیں اور چوٹی کی نرم اور بے پتہ شاخوں پر سو جاتے ہیں۔ ایک درخت کی چوٹی پر چھ سات سات لنگور ہوتے ہیں مادہ لنگوروں کے ساتھ ان کے دو سال تک کے بچے بھی ہوتے ہیں۔ نر کی بھی کوشش ہوتی ہے وہ اپنے بچے کے قریب ہی رہے اس لئے باقی لنگور ان سے کئی فٹ دور جاکر بسیرا کرتے ہیں ان کی زیادہ تر گزر اوقات جنگلی پھلوں، کونپلوں اور بیجوں وغیرہ پر ہوتی ہے ہم نے ایمزن بن میں اپنے ڈیڑھ سالہ قیام کے دوران اس بات کا بھی کھوج لگانے کی کوشش کی ہے کہ ایک ایسے جنگل میں جس میں سال کا بیشتر حصہ درخت پانی میں ڈوبے رہتے ہیں خشکی کی مخلوق یعنی لنگوروں کا زندہ رہنا کیسے ممکن ہے۔

ہمارے مشاہدے کے مطابق رات کا بسیرا یہ چوٹیوں پر ہی کرتے ہیں۔ صبح چھ بجے سورج کے افق پر نمودار ہوتے ہی ان کے دن کا آغاز ہو جاتا ہے۔ ساڑھے چھ بجے تک پورے کا پورا جھنڈ اتنا نیچے آجاتا ہے کہ پانی ان سے صرف ۲۵، ۳۰ فٹ نیچے رہ جاتا ہے یہاں بیٹھ کر یہ "ناشتہ" کرتے ہیں اور مزید پھلوں کی تلاش میں نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ چھ چھ کی ٹولیاں بنا کر یہ جھنڈ کم و بیش اڑھائی ایکڑ کے علاقے میں پھیل جاتا ہے۔ یہ سب ایک ہی رفتار سے ایک ہی سمت بڑھنا شروع کر دیتے ہیں۔ آپ ایک درخت میں پانچ چھ لنگوروں کو دیکھ سکتے ہیں۔ لیکن پانی میں گرنے والے پھلوں اور لنگوروں کی مدہم کا..... کا..... کا..... کی آواز سے آپ جھنڈ کے باقی لنگوروں کے متعلق

با آسانی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ وہ اس وقت کہاں کہاں ہیں۔ گلنار لنگور سہ پہر ایک بجے تک یہ "مارچ" جاری رکھتے ہیں۔ اس وقت تک سورج سر کے عین اوپر آچکا ہوتا ہے۔ جنگل کا درجۂ حرارت ۱۰۴ فارن ہیٹ اور ہوا میں نمی کا تناسب ۹۰ فیصد سے بھی زیادہ ہوتا ہے۔ ایک اور تین بجے کے درمیان لنگوروں کی اکثریت نرم اور پتے دار شاخیں تلاش کر کے ان پر "قیلولہ" کرتی ہے اور ۳ بجے یہ جھنڈ پھر آگے بڑھنا شروع کر دیتا ہے اور شام چھ بجے تک چلتا رہتا ہے جو نہی جھٹپٹے کا آغاز ہوتا ہے کا..... کا..... کی اونچی اونچی آوازیں آنا شروع ہو جاتی ہیں اس وقت تک جھنڈ پانچ کلو میٹر کے قریب فاصلہ طے کر چکا ہوتا ہے اور ۲۵۰۰ فٹ کے علاقے میں پھیلا ہوتا ہے۔ تقریباً

۲۰ منٹ تک یہ آوازیں مسلسل آتی رہتی ہیں جنہیں سن کر لنگور ایک جگہ اکٹھے ہو جاتے ہیں اور اندھیرا پھیلنے تک درختوں کی چوٹیوں تک پہنچ جاتے ہیں اگر کبھی آندھی چل رہی ہو تو لنگور ننگی شاخوں کی بجائے پتوں والی گھنی شاخوں میں چلے جاتے ہیں جس دن بارش ہو رہی ہو دن میں ذرا تاخیر سے اٹھتے ہیں ورنہ عام طور پر ان کا معمول یہی رہتا ہے۔

مادہ گلنار لنگور موسم برسات کے شروع میں (یعنی اکتوبر نومبر میں) بچے دیتی ہے پہلے دو ماہ تک بچوں کے نہ تو چہرے ہی اپنے والدین کی طرح گلنار ہوتے ہیں اور نہ ہی سر گنجے ہوتے ہیں بلکہ چہرے گہرے سرمئی اور سر بال دار ہوتے ہیں۔ تین سے پانچ ماہ تک کے بچے ٹھوس غذا کھانا شروع کر دیتے ہیں اور ایک سال کے قریب عمر کے بچوں کی خوراک کا ۸۶ فیصد پکے پھل یا ان کے بیج اور ۱۴ فیصد حشرات اور ان کے انڈے بچے ہوتا ہے۔

سال میں ایک موسم ایسا بھی آتا ہے جب پھل تقریباً ختم ہو جاتے ہیں ہم نے اگست ۱۹۸۳ء میں پہلی مرتبہ مشاہدہ کیا کہ اس موسم میں وہ کیا کھاتے ہیں۔ اس وقت پانی تیزی سے اتر رہا تھا اور کچھ دنوں میں جنگل کی دلدلی زمین نظر آنا شروع ہو گئی ہم نے ۳۰۰ فٹ دور سے مشاہدہ کیا کہ لنگوروں کا ایک جھنڈ ایک ایک کر کے زمین پر اترا اور تمام لنگور سیپوٹیسیائی (Sapotaceae) نسل کے ننھے ننھے پودے تلاش کرنے لگے۔ دور سے یہ بالکل سفید خرگوشوں کی طرح لگ رہے تھے اور انہی کی طرح اچھل کود بھی کر رہے تھے جونہی کسی لنگور کو ایسا کوئی پودا نظر آتا وہ اسے فوراً اکھاڑ دیتا اور اس کی جڑ کے ساتھ لگے ہوئے بیج کو کھا لیتا اس بیج کی کیمیائی تجزیئے کے بعد انکشاف ہوا کہ اس بیج میں تیل کی کافی مقدار ہوتی ہے جو نہ صرف بھرپور غذائیت، کا کام دیتی ہے بلکہ بیج کو پانی کے اثرات سے بھی محفوظ رکھتی ہے۔ اکتوبر کے مہینے میں بہار کے موسم کی آمد کے ساتھ ہی درختوں پر پھول لگنا شروع ہو جاتے ہیں اس موسم میں جنگل کی زمین پھولوں کی پتیوں اور ڈنٹھلوں وغیرہ سے بھر جاتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ موسم بہار آتے ہی گلنار لنگور بڑے ڈرامائی انداز میں اپنی "خوراک" بدل دیتے ہیں اور پھول توڑ توڑ کر ان کا شہد (Nectar) چوسنا شروع کر دیتے ہیں۔ پھر جب پھل پک جاتے ہیں تو یہ پھلوں کو اپنی خوراک بنانا شروع کر دیتے ہیں۔

لنگوروں کا ایک جھنڈ ایک دن میں کتنا فاصلہ طے کرتا ہے اس کا انحصار خوراک کی دستیابی پر ہے۔ پانی کے بہت زیادہ چڑھ آنے کے موسم میں جب کہ پھلوں کی کثرت ہوتی ہے یہ اوسطاً ۷ کلو میٹر روزانہ سفر طے کرتے ہیں لیکن خزاں کے موسم میں جب کہ پانی بھی اتر جاتا ہے ان کا اوسط سفر دو کلو میٹر فی دن رہ جاتا ہے۔

تو ناظرین ..... اس وقت یہاں کھانے کا وقفہ ہے

کالے بادل

شاہنواز فاروقی

کالے کالے بادل آئے
ننھّی ننھّی بوندیں لائے
رین کوٹ کی قسمت جاگی
چھتری پھُولی نہیں سمائے
بجلی ناچ رہی ہے چھم چھم
چندا چھُپ کر ڈھول بجائے
دھرتی پیاس بجھا کر اپنی
ہریالی کے گانے گائے
ناؤ بنادی ہے ممّی نے
حارو پانی میں تیرائے
جھینگر بین بجانے بیٹھے
مینڈک ٹرٹر ٹرٹرآئے
کوّا بھیگ گیا بیچارا
بیٹھا اپنے پر پھیلائے

(ماخوذ)

صلۂ شہید کیا ہے؟

شبانہ احمد سولنگی

"اماں جی! آپ سب رومالوں پر ایک ہی طرح کے پھول کیوں کاڑھ رہی ہیں؟ یہ پھول کونسا ہے؟ اس کا نام کیا ہے اماں جی؟"

ننھا راشد دادی کے قریب بیٹھا بڑی معصومیت سے رومال پر پھول بنتا دیکھ رہا تھا۔

"یہ یاسمین کا پھول ہے بیٹے! جانتے ہو یہ پھول ہمارا قومی پھول ہے اور یہ سب رومال میں اپنے فوجی بیٹوں کے لئے کاڑھ رہی ہوں۔"

اماں جی نے تمام باتیں سمجھانے کے انداز میں کہیں۔ اسی وقت ہمسائی نے اس دیوار پر سے جھانکا

جہاں تخت پر دیوار سے ٹیک لگائے اماں جی رومالوں پر پھول کاڑھ رہی تھیں۔

"اماں جی! آپ تھکتی نہیں؟ صبح سے شام تک۔ کاڑھتی رہتی ہیں۔"

"اے بیٹی! اس میں تھکنا کیسا؟" اماں جی نے سر اوپر اٹھایا اور عینک کو جو ناک کی پھننگ پر پھسل آئی تھی، ٹھیک سے جماتے ہوئے خوشدلی سے کہا۔ "رومالوں پر یہ ننھے ننھے پھول ہی تو بناتی ہوں اور کیا کرتی ہوں؟ وہ جو ملک کی سرحدوں پر اتنی بھاری بھاری بندوقیں اٹھائے دن رات پہرہ دیتے ہیں، ان کے تھکنے کا خیال نہیں آتا تمہیں۔" اماں جی پڑوسن کو ناصحانہ انداز میں سمجھانے لگیں۔

"میں نے اس لئے تھوڑی کہا تھا۔ میں تو ہر وقت فوجی بھائیوں کے لئے دعا کرتی رہتی ہوں۔" ہمسائی شرمندہ سی ہو گئی۔

"بس خالی خولی دعا ہی کرتی ہو۔ ہاتھ پیر بھی ہلایا کرو۔"

"نہیں اماں جی میں نے تو ہاتھ پیروں سے جو کچھ ہوا، کیا۔ آپ کو معلوم نہیں کہ جنگ کے زمانے میں میں نے اتنے بہت سے لحاف جمع کئے، چندہ اکٹھا کیا اور پھر ساری سردی اپنے بھائیوں کے لئے سوئیٹر بنتی رہی۔" اس نے اماں جی کو مطمئن کرنا چاہا۔

"ہاں بی بی!" اماں جی کی عینک پھر ناک کی پھننگ پر کھسک آئی۔ "جنگ کے زمانے میں تو بچے بچے نے جہاد میں حصہ لیا۔ کسی نے محاذ جنگ پر اور کسی نے گھر بیٹھ کر۔ اس وقت کی بات اور تھی ساری قوم ایک ہو گئی تھی۔ دلوں میں محبت اور خلوص تھا۔ مگر اب کہاں؟ اب تو یہ ساری باتیں خواب ہو گئی ہیں۔" اماں جی نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔

"آپ کا خیال غلط ہے۔ جنگ کی باتیں خواب نہیں آج کی زندہ حقیقت بن گئی ہیں۔ آج بھی وہی جذبہ ہے اور انشاء اللہ ہمیشہ رہے گا۔ مسلمان بیدار ہو چکے ہیں۔" ہمسائی نے اماں جی کی غلط فہمی دور کرنی چاہی۔

"ہاں!" اماں جی نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے بولیں۔ "میرا تو جی چاہتا ہے سب کچھ وطن پر قربان کر دوں۔ بس اب میری جان رہ گئی ہے۔ سو وہ بھی کسی دن کام آجائے گی۔ اور راشد!" انہوں نے راشد کی طرف محبت بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا "یہ بھی باپ دادا کے نقش قدم پر چلے گا۔"

"اماں جی! میں بڑا ہو کر کپتان بنوں گا اور سب دشمنوں کو مار بھگاؤں گا۔" راشد سینہ تان کر

کھڑا ہو گیا۔

"اللہ تعالیٰ قوم کے ان سپوتوں کے سینے جوشِ ایمان اور جوشِ جہاد سے معمور کر دے۔" اماں جی کی آنکھوں میں نمی آ گئی۔

"وہ دن بھی کیا دن تھے۔ ہر شخص وطن کی محبت میں سرشار شہادت کے نشے میں چُور۔ وطن پر مر مٹنے کی آرزو لئے آگے بڑھ رہا تھا۔ کتنا اچھا لگتا تھا جب ننھے ننھے بچے قومی دفاعی فنڈ میں اپنا جیب خرچ دے دیتے تھے۔ عورتیں اپنا زیور مادرِ وطن کی پیشانی پر سجا رہی تھیں۔ اپنا سہاگ لٹا کر وطن کا سہاگ قائم رکھنے کی دعائیں مانگ رہی تھیں اور سب گھر پر بیٹھیں اپنے فوجی بھائیوں کے لئے سوئیٹر اور لحاف تیار کرتی تھیں۔ کتنا اچھا لگتا تھا۔ عورتیں باتیں کم کرتی تھیں اور سوئیٹر زیادہ بنتی تھیں۔" اماں جی جاگتی آنکھوں جنگ کے دنوں کے خواب دیکھ رہی تھیں۔

"لوگ کہتے ہیں کہ اب کے بہار نہیں آئی۔ اونہہ! کیسے نادان ہیں یہ لوگ۔ بہار تو قوم کے بیدار ہونے کا نام ہے۔ جب قوم بیدار ہو گئی۔ اس کا عزم جوان ہو گیا۔ سمجھو وطن میں بہار آ گئی۔ لوگ یہ بات کیا جانیں۔ اب پاکستان میں کبھی خزاں نہیں آئے گی۔ ہر سو بہار ہی بہار ہے۔ سدا بہار ہی رہے گی۔" وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی رہیں اور پھر جیسے اچانک انہیں کوئی بات یاد آ گئی۔ چہرہ فخر و شادمانی سے جگمگا اٹھا۔

"بہو بیگم! اے بہو بیگم!" انہوں نے راشد کی ماں کو آواز دی۔

"جی اماں جی!" بہو پاس آ کر مؤدبانہ لہجے میں بولیں۔

"بیٹی! میری شلوار قمیص اور دوپٹہ استری کر دو۔ کل ۲۳ مارچ ہے۔ کل میرے بیٹے کو ہلالِ جرأت کا اعزاز ملنے والا ہے۔ وہ تو دنیا کا سب سے عظیم اعزاز جامِ شہادت حاصل کر چکا ہے۔ اب یہ اعزاز میں وصول کروں گی۔" وہ جذبات سے بھرے لہجے میں بولیں۔

"کتنے پیارے بچے تھے میرے۔ ساری قوم کے بچے ایسے ہی ہوتے ہیں۔" انہوں نے تصور ہی تصور میں مستقبل کے معماروں کی بلائیں لے لیں۔

"عارف، حامد، اور فاخرہ..... جب پاکستان صفحۂ ہستی پر ابھرا تو یہ تینوں معصوم غنچے ہی تو تھے۔" وہ جیسے اپنے بچوں کی کہانی اپنی بہو کو سنا رہی تھیں۔ "میں نے کیسی کیسی حفاظت کی، کہیں یہ کلیاں مرجھا نہ جائیں انہیں اس دن کے لئے کمھلانے سے بچایا کہ یہ وطن کے باغبان بنیں۔ وطن کے پھولوں اور کلیوں

کی حفاظت کریں۔ اور ان کے باپ ..... " اماں جی کو اپنے شہید شوہر یاد آگئے۔ "انہوں نے وطن کی گلستان کو اپنے خون سے سینچا تھا۔ ۷۴ء کی ایک خون آلود شام کو وطن کے ناموس کی حفاظت کرتے ہوئے شہید ہوئے تھے۔ "

اماں جی کی پلکیں بھیگ گئیں اور انہوں نے اپنے شوہر پر عقیدت کے دو آنسو نچھاور کر دیئے۔

"تینوں بچوں کے لئے انہوں نے کیا چھوڑا۔ عزم و ہمت، خود اعتمادی اور جوانمردی کا سرمایہ۔ حُب الوطنی کا خزانہ۔ ان کے بعد یہ بچے ہی میرا کل اثاثہ تھے۔ " اماں جی کا ذہن ماضی کی یادوں میں بھٹکنے لگا۔ "عارف تو کچھ بڑا بھی تھا مگر فاخرہ اور حامد تو بہت چھوٹے چھوٹے تھے۔ عارف تو چند سال کے بعد ہی ہوائی فوج میں بھرتی ہو گیا تھا۔ پھر میں نے عارف کی شادی کر دی اور تجھے بہو بنا کر لے آئی۔ تجھے یاد ہے نا؟ فاخرہ اور حامد تب اسکول میں پڑھتے تھے۔ " انہوں نے بہو کے چہرے پر دیکھا وہاں بھی یادوں کے چراغ روشن تھے۔

"فاخرہ کو بچپن سے ہی ڈاکٹر بننے کا شوق تھا، لیکن قسمت نے اسے نرس بنا دیا، لیکن وہ اس پیشے میں بھی خوش ہے۔ فخر سے کہتی ہے کہ کسی طرح میں ملک اور قوم کے کام تو آ رہی ہوں۔

تو جانتی ہے نا بہو! حامد کا دل پڑھائی سے اچاٹ ہو گیا تھا اور وہ بُری صحبتوں میں پڑ گیا تھا۔ " اماں جی نے بڑے دُکھی دل سے کہا۔ "کتنا خفا ہوتی تھی میں اس پر اور کس پیار سے وہ میرے گلے میں بانہیں ڈال کر کہتا تھا،

"اماں جی ایک دن آپ مجھ پر فخر کریں گی۔ وہ دن دور نہیں بس آیا ہی چاہتا ہے۔ "

اور واقعی ہوا بھی یہی۔ اچانک ہی دشمن نے حملہ کر دیا۔ کسی کو گمان بھی نہیں تھا کہ ایسا ہو سکتا ہے۔ دشمن کی ٹڈی دل یلغار..... توبہ خدا کی پناہ" اماں جی کو جھرجھری سی آگئی۔ "مٹھی بھر مسلمانوں نے ان کو کیسی سزا دی۔ " اماں جی کو جنگ یاد آگئی۔

"زخمی فوجیوں کی تیمار داری کے لئے جانے والی لڑکیوں میں سب سے پہلا نام فاخرہ کا تھا۔ جنگ کے تیسرے روز جب وہ محاذ پر جانے سے قبل مجھ سے رخصت ہو رہی تھی تو ڈاکیہ نے تار لا کر دیا تھا۔ فاخرہ نے کس صبر و سکون سے پڑھا تھا! اسکواڈرن لیڈر عارف شہید ہو گئے۔

بہو! رب العزت کا شکر ہے کہ اس نے عارف کو سب سے بڑا اعزاز دیا۔ ہمارے رب نے ہمیں بہت بڑی عزت بخشی ہے۔ ورنہ ہم گنہگار اس قابل کہاں کہ اپنے اسلاف کی روایت کو

دہراتے۔ "

"اب تو شہید کا بیٹا ہے۔ " فاخرہ نے راشد کی پیشانی چوم لی تھی۔

"اب یہ وطن کی امانت ہے، اس کی تربیت میں کوتاہی نہ کرنا بہو! یہ بچے ہی تو وطن کا قیمتی سرمایہ ہیں۔ " انہوں نے پیار سے راشد کو دیکھا۔ بہو آنکھوں میں آنسو لئے وہاں سے اٹھ گئی اور اماں خود سے باتیں کرتی رہ گئیں۔ "جس وقت عارف کی شہادت کی خبر آئی، حامد کے دوست کہتے ہیں کہ وہ اپنے دوست کے گھر پر تاش کھیل رہا تھا۔ کسی نے اسے خبر دی کہ تمہارے بڑے بھائی شہید ہوگئے ہیں، تو اس نے کہا تھا،

"میرا بھائی وطن کی آبرو پر کٹ مرا ہے اور میری بہن وطن کے ناموس پر زخمی ہونے والوں کی مرہم پٹی اور دلجوئی کرنے کے لئے گئی ہے اور میں یہاں بیٹھا تاش کھیل رہا ہوں۔ لعنت ہے مجھ پر۔ " اس کے دوست نے یہی بتایا تھا کہ اس نے تاش کی گڈی کے دو ٹکڑے کر دیئے تھے۔ پھر وہ چلا گیا تھا۔ اور مجھ سے کہہ گیا تھا، " دیکھ لینا اب اماں جی! آپ ہی نہیں پورا ملک مجھ پر بھی فخر کرے گا۔

"اماں جی میں اپنے وطن کے لبوں سے مسکراہٹ نوچنے والوں کے سینوں میں خنجر پیوست کرنے جارہا ہوں۔ "

اس کی حالت اس وقت ایک مجاہد جیسی تھی۔ "اماں جی" وہ میرے قدموں پر جھکا ہوا کہہ رہا تھا۔ "وہ وقت آگیا ہے، جس کا مجھے انتظار تھا۔ وطن مجھے پکار رہا ہے۔ آپ مجھے اجازت دیں۔ میری پیشانی کو بوسہ دیں اور مجھے رخصت کریں۔ " اور پھر وہ اکیلا چلا گیا تھا۔ سیڑھیوں پر سے اترتے ہوئے جب اس نے سنا۔

"میرے ڈھول سپاہیا، تینوں رب دیاں رکھاں۔ "

تو اس نے آہستہ سے کہا تھا "یہاں رب ہی سب کا رکھوالا ہے۔ "

کسی کو نہیں معلوم کہ وہ بری فوج میں کس طرح لے لیا گیا۔ شاید اس لئے کہ وہ نشانے کا پکا تھا، سپاہی کا بیٹا تھا اور سپاہی کا بھائی تھا۔ اور کل اسے ہلالِ جرأت مل رہا ہے۔ "

پھر انہوں نے اپنے بچوں کے لئے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے اور آنسو ان کے رخساروں کو بھگونے لگے۔

بہو بیگم نے کپڑے استری کر کے لاکر کھونٹی پر ٹانگ دیئے۔ تو انہوں نے ہاتھ منہ پر پھیر کر آنسو

پونچھے اور پھر سے رومال پر پھول کاڑھنے لگیں۔

اور بہو بیگم سوچ رہی تھیں کہ انہوں نے حامد اور عارف کی شہادت کی خبر کو بڑے سکون کے ساتھ سنا تھا اور جب بھی کسی نے ہمدردی ظاہر کی تو انہوں نے کہا۔ ''میرا جی چاہتا ہے کہ سب کچھ وطن پر قربان کر دوں۔'' یہ کہتے ہوئے ان کی نظریں ننھے راشد کی بلائیں لے رہی ہوتی ہیں۔ کتنا بڑا دل ہے ان کا کتنی ہمت ہے ان کی۔

دوسرے دن اماں جی خود تمغہ لینے پہنچی تھیں۔ بہو بیگم اور فاخرہ ان کے ساتھ تھیں۔ ننھا راشد سر اٹھائے چل رہا تھا۔

جب تالیوں کی گونج میں اماں جی کے سینے پر ہلالِ جرأت لگایا گیا تو ان کی جھکی ہوئی کمر تن گئی اور وہ سیدھی کھڑی ہو گئیں۔ ان کا چہرہ فخر سے جگمگا رہا تھا۔

ننھا راشد اپنے دوست کو کسی فوجی نوجوان کی تصویر دکھا کر کہہ رہ تھا۔

''جب میں بڑا ہو جاؤں گا اور چچا جان کی طرح دشمنوں کو مارتے ہوئے شہید ہو جاؤں گا تو میری امی بھی اسی طرح آئیں گی اور صدر صاحب ان کے سینے پر ہلالِ جرأت آویزاں کریں گے۔''

اور پاس بیٹھا ہوا غیر ملکی سوچ رہا تھا کہ جس قوم کے فرزند ایسے ہوں اس قوم کو کون شکست دے سکتا ہے؟

پتے کی بات

''اپنا علم دوسروں کو سکھاؤ تا کہ تمہاری معلومات کی بنیاد مستحکم ہو اور دوسروں کا علم بھی سیکھو تا کہ تمہاری معلومات کی سطح بلند تر ہو جائے۔''

(امام حسن علیہ السلام)

مرسلہ: عبدالرشید شیخ

(یہ واقعہ کینیڈا میں پیش آیا)

قاری سیف الدین

شکر ہے بھرم رہ گیا

میں امریکہ کے شہر پلین فیلڈ میں تھا جب میری ملاقات کینیڈا کے فاروق صاحب سے ہوئی۔ فاروق صاحب انگریزی کے ساتھ ساتھ فرانسیسی اور یورپ کے بعض دوسری زبانوں پر بھی عبور رکھتے ہیں۔ تھوڑی بہت دسترس عربی پر بھی ہے۔ امریکہ اور کینیڈا میں تحریک اسلامی کے سرگرم کارکن ہیں۔

اپنے دعوتی اور تحریکی مشاغل کی روداد سناتے ہوئے انہوں نے کہا: "ایک مرتبہ کینیڈا کے ایک ہسپتال میں میری ملاقات دو ڈاکٹروں سے ہوئی۔ ایک یہودی تھے اور دوسرے عیسائی۔ یہ ان کا وقفہ فراغت تھا۔ ان لئے باتوں میں مصروف تھے۔ مجھے ان کی گفتگو میں شریک ہونے کا موقع ملا تو میں نے "اہل کتاب کا تعلق اہل اسلام سے" کے موضوع کو محور بنایا۔"

یہ ایک شائستہ مجلس تھی۔ دونوں ڈاکٹر صاحبان بڑی دلچسپی سے میرے نکات سن رہے تھے۔ جب میری گفتگو میں اسلامی عبادات کا ذکر آیا تو انہوں نے کہا کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام میں بہت سی خوبیاں ہیں، لیکن جہاں تک روزوں کا تعلق ہے ان میں کسی افادیت کا ہونا ممکن نہیں۔ بلکہ اپنے نامانوس اوقات کے باعث یہ روزے انسان کے لئے مضر صحت ہی ہوسکتے ہیں۔ راتوں کو اٹھ کر کھانا اور پھر طویل دن کے دوران میں نہ کچھ کھانا، پینا کیسے صحت کے لئے مفید ہوسکتا ہے۔

یہ ان دونوں صاحبان کے تبصرے کا خلاصہ تھا۔

میں میڈیکل سائنس سے ناواقف ہوں۔ اس لئے ان کے تبصرے کے جواب میں میرے پاس کوئی میڈیکل دلیل نہیں تھی۔ لیکن اس ایمان ویقین کے بل بوتے پر، جو مجھے اسلام کے ساتھ وابستہ کئے ہوئے ہے اور جس کی وجہ سے میں امریکہ جیسے مادہ پرست ملک کے طول و عرض میں شہادت حق کا فریضہ انجام دے رہا ہوں، میں نے ان سے کہا کہ آپ سمجھتے ہیں روزہ مضر صحت عبادت ہے اور میرا یقین کامل ہے کہ روزہ انسانی صحت کی ترقی میں مدد دیتا ہے۔

چوں کہ میں نے کسی میڈیکل تھیوری اور ثبوت کے بغیر یہ بات کہی تھی اس لئے انہوں نے قہقہہ لگایا۔ وہ میرا مذاق نہیں اڑا رہے تھے۔ یہ ان کی طرف سے صرف اس امر کا اظہار تھا کہ کسی دلیل یا ثبوت کے بغیر وہ میرا نقطۂ نظر قبول نہیں کرسکتے..... معاً مجھے خیال آیا کہ اللہ کے بھروسہ پر کیوں نہ ان کے سامنے عملی ثبوت کی بات رکھ دوں۔ چنانچہ دوسرے لمحے میں نے ان کے سامنے ایک تجویز رکھی اور میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ انہوں نے بلا تامل میری تجویز منظور کرلی۔

تجویز یہ تھی کہ وہ چار پانچ روزہ دار مسلمانوں کے رمضان سے پہلے بھی معائنہ کرلیں اور رمضان کے آخر میں بھی معائنہ کر کے دیکھ لیں۔ اس سے ساری حقیقت سائنسی اور طبّی اصولوں کے مطابق سامنے آجائے گی۔

طے پایا کہ معائنہ تین مرحلوں میں ہوگا۔ یہ بھی طے ہوگیا کہ اس مقصد کے لئے افراد میں ہی پیش کرونگا۔ چنانچہ پروگرام کے مطابق شعبان کی پہلی تاریخ کو میں اپنے پانچ دوستوں کو لے کر ان کے پاس آیا۔ ڈاکٹر صاحبان نے میری طرف سے اپنا وعدہ پورا کرنے پر خوشی کا اظہار کیا۔ اور اس کے بعد بڑے انہماک اور باریک بینی کے ساتھ معائنہ شروع ہوا۔ ہر ٹیسٹ کے بعد وہ ہمیں کچھ بتائے بغیر اپنی نوٹ بک میں کچھ لکھتے رہے۔ جب ان کے اندراجات مکمل ہوگئے تو انہوں نے شعبان کی آخری تاریخ کو، یعنی رمضان سے ایک دن پہلے پھر آنے کو کہا۔ ہم نے ایسا ہی کیا۔ اور اس کے ساتھ رمضان المبارک کا آغاز ہوگیا۔

میں نے اللہ تعالیٰ پر بھروسے اور دین حق پر کامل یقین کے ساتھ جو قدم اٹھایا تھا، اب اس کا نتیجہ سامنے آنا تھا۔

رمضان کی اٹھائیس تاریخ تھی جب انہوں نے تیسری اور آخری بار میرے دوستوں کا معائنہ کیا۔ وہ اپنے ٹیسٹ مکمل کر رہے تھے اور ہم ان کے چہروں پر بڑھتی ہوئی حیرت دیکھ رہے تھے۔

جب وہ اپنے اندراجات مکمل کر چکے تو ہماری طرف متوجہ ہوئے۔

انہوں نے بتایا کہ پہلے دو معائنوں میں انہوں نے میرے پانچ دوستوں میں جو چھوٹے موٹے امراض اور طبّی لحاظ سے جو خامیاں نوٹ کی تھیں وہ اس آخری معائنے میں کلیتہً ختم ہو چکی ہیں اور کسی

Midas

مرض کا نام و نشان باقی نہیں رہا ہے۔

انہوں نے کہا کہ یہ سب کچھ ناقابل یقین ہے۔ لیکن ہمارے جدید ترین میڈیکل آلات اور ہمارا سارا معائنہ اس کی تصدیق کر رہا ہے کہ آپ کے دوست اس مہینے کے دوران میں مزید بیمار ہونے کے بجائے بالکل صحت مند ہو گئے ہیں۔

انہوں نے مجھے مبارک باد دی اور پھر دونوں نے مجھے الگ الگ سرٹیفیکیٹس لکھ کر دئے جو میرے پاس ہر وقت موجود رہتے ہیں۔

یہ کہتے ہوئے فاروق صاحب نے اپنا بریف کیس کھولا اور دونوں فریم کئے ہوئے سرٹیفکیٹ میرے سامنے رکھ دئے۔

اس وقت میں نے دیکھا کہ اپنے یہ کاغذات دکھاتے ہوئے ان کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے ہیں ..... یہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے والے انسان کی آنکھیں تھیں۔

میں آج بھی سوچتا ہوں کہ ہم میں سے کتنے لوگ اس سچائی کے صحیح قدر شناس ہیں جو ایک کامل و اکمل دین کی صورت میں ہمیں حاصل ہے۔

توجّہ فرمائیے

اطفال نمبر میں شائع ہونے والی دو تحریروں "بچّوں کے کارنامے" بچّوں کی عالمی تنظیم" کے مصنّفین عمران قادر صاحب اور امتیاز جلیل صاحب سے گزارش ہے کہ جلد از جلد اپنے ایڈریس ہمیں روانہ کریں تاکہ ان کی تحریروں کا معاوضہ بھجوایا جا سکے۔ (ادارہ)

فرانس کے ایک فضائی مظاہرے میں ایک موقع پر جب دو جیٹ ہوائی جہاز یوں آمنے سامنے آگئے تو دیکھنے والے دم بہ خود رہ گئے کہ کہیں یہ ٹکرا ہی نہ جائیں حالانکہ دونوں جہاز محفوظ فاصلے پر تھے، اسے تو آپ فریبِ نظر کہہ لیجئے!

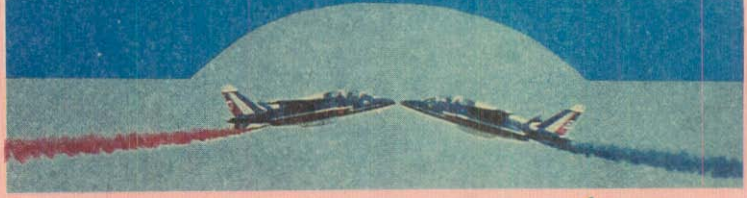

ٹکرا گئے جہاز — یا — بچ کر نکل گئے؟

دو دھڑکا اک ہرن ہے یا تصویر کا کمال؟

شعبۂ تحقیق و تلاش ماہنامہ آنکھ مچولی

بیراگی

نیر مسعود، لکھنؤ

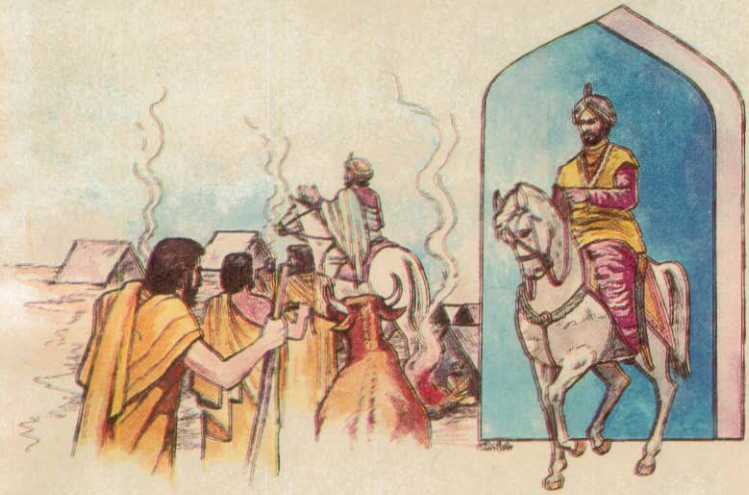

"آج سیکولر بھارت میں بے گناہ مسلمانوں کا خون بہایا جارہا ہے اس سچی کہانی کو پڑھیے اور موازنہ کیجئے کہ مسلمان بادشاہوں کے زمانہ میں ہندوؤں کے ساتھ کتنی رواداری اور شفقت کا برتاؤ کیا جاتا تھا۔"

(ادارہ)

مہاراجہ بال کشن اودھ کے آخری بادشاہ سلطان عالم واجد علی شاہ کے دیوان تھے جن کا کام حکومت کی آمدنی اور خرچ کا حساب کتاب کرنا تھا۔ انہیں بادشاہ کی طرف سے بھاری تنخواہ ملتی تھی جس کو وہ

دل کھول کر خرچ کرتے تھے۔ وہ ہر سال برسات کے موسم میں ہندوستان کے سادھوؤں کی دعوت کرتے تھے۔ یہ دعوت لکھنؤ کے عیش باغ میں ہوتی تھی اور پورے چار مہینے تک چلتی تھی۔ عیش باغ کی موتی جھیل برساتی پانی سے لبالب بھری ہوتی اور اس کے ارد گرد میلوں تک پھیلا ہوا باغ دور دور کے شہروں، دیہاتوں، جنگلوں اور پہاڑوں سے آئے ہوئے سادھوؤں سے بھر جاتا تھا مہاراجا کی طرف سے ان سب سادھوؤں کے کھانے پینے اور پوجا پاٹ کا انتظام ہوتا تھا۔ چار مہینے تک عیش باغ میں بڑی چہل قدمی رہتی برسات کا زمانہ ختم ہونے پر آتا تو سادھوؤں کے قافلے واپس روانہ ہو جاتے اور دوسرے سال پھر آکر مہاراجا کے مہمان ہوتے اور پھر چار مہینے تک عیش باغ میں سادھوؤں کا میلا رہتا تھا۔

واجد علی شاہ کے وزیر اعظم نواب علی نقی خان کو جو حضورِ عالم کہلاتے تھے اس طرح ہر سال لکھنؤ میں سادھوؤں کا جمگھٹ لگنا پسند نہیں تھا، شاید اس لئے کہ اس کی وجہ سے لکھنؤ میں بلکہ ہندوستان بھر میں مہاراجا کا نام نواب کے نام سے زیادہ مشہور ہو گیا تھا۔ نواب اس فکر میں رہتے تھے کہ کسی طرح واجد علی شاہ اس میلے کو ختم کرنے کا حکم دے دیں۔ آخر ایک دن جب میلے کو شروع ہوئے ایک مہینہ ہو رہا تھا، انہوں نے بادشاہ کے دربار میں اس کی بات چھیڑی:

"سلطانِ عالم، آج کل تو عیش باغ میں خوب رونق ہے۔"

"اچھا، کیوں؟" بادشاہ نے پوچھا۔

"سادھوؤں کا میلا چل رہا ہے، جہاں پناہ!"

"ہاں ہم نے سنا ہے برسات کی رُت میں مہاراجا بال کشن عیش باغ میں کچھ سادھوؤں کو بلاتے ہیں۔"

"کچھ سادھوؤں کو نہیں، ہزاروں کو، جہاں پناہ، ہزاروں کو۔ ملک بھر کے سادھو آجاتے ہیں۔"

"ہاں؟ پھر تو سچ مچ ہزاروں جمع ہو جاتے ہوں گے۔"

"اور سلطانِ عالم، یہ سب پورے چار مہینے تک عیش باغ میں ڈیرے ڈالے رہتے ہیں!"

"چار مہینے تک!؟"

"اور سلطانِ عالم، چار مہینے تک ان ہزاروں سادھوؤں کے کھانے پینے، رہنے سہنے کا سارا خرچ مہاراجا بال کشن اپنی جیب سے دیتے ہیں۔"

"اوہو! اس میں تو مہاراجا کا بڑا پیسا اٹھ جاتا ہو گا۔"

"مگر سلطانِ عالم، مہاراجا کے پاس اتنا پیسا کہاں سے آیا؟ میں تو سمجھتا ہوں کہ یہ دعوتیں شاہی خزانے کے پیسے سے ہوتی ہیں۔"

"نہیں حضور عالم، کسی کے بارے میں بری بات نہ سوچنا چاہئے۔"

"سلطانِ عالم، سرکاری پیسے کا سارا حساب کتاب مہاراجا کے ہاتھ میں رہتا ہے، جو چاہیں وہ کریں۔"

"مگر ہمارے راجا ایسے آدمی نہیں ہیں۔"

"مگر سلطانِ عالم، پھر ہزاروں آدمیوں کو چار مہینے تک روزانہ ....."

"..... اچھا بھئی آج شام کی سیر میں ہم عیش باغ جائیں گے اور خود دیکھیں گے۔"

علی نقی خان کو اطمینان ہوا کہ اب ان کا مطلب پورا ہو جائے گا۔

ادھر بادشاہ کے درباریوں میں سے کسی نے مہاراجا بال کشن کو اس بات چیت کی خبر پہنچادی۔ علی نقی خان وزیراعظم ہی نہیں، واجد علی شاہ کے سسرے بھی تھے اور بادشاہ ان کی بات بہت مانتے تھے۔ مہاراجا یہ خبر سن کر پریشان ہوگئے کہ حضور عالم نے بادشاہ کو ان کے خلاف بھڑکایا ہے مہاراجا خود بھی روز شام کو سادھوؤں سے ملنے عیش باغ جاتے تھے۔ لیکن اس شام وہ اس ڈر سے وہاں نہیں گئے کہ کہیں بادشاہ ان کے مہمانوں کے سامنے ہی ان پر غصہ نہ کرنے لگیں۔

..... (۲) .....

سورج ڈوب رہا تھا۔ عیش باغ میں ہر طرف سادھوؤں کی کٹیاں دکھائی دے رہی تھیں جن پر نئے پھونس کے چھپر پڑے ہوئے تھے۔ بہت سی کٹیوں کے آگے ترشول گڑے ہوئے اور لال کپڑے کی تکونی جھنڈیاں لہرا رہی تھیں۔ زیادہ تر سادھو اپنی اپنی کٹی سے باہر نکل آئے تھے۔ ان میں تپسّوی، جوگی، بیراگی، سبھی تھے۔ کوئی منتروں کا جاپ کر رہا تھا۔ کوئی بھجن گا رہا تھا، کوئی اپنے چیلوں کو اپدیش دے رہا تھا اور کوئی کتھا سنا رہا تھا۔ کمرخ اور آملے کے درختوں کے نیچے کہیں کہیں کوئی گائے بندھی تھی جس کے سینگ سیندور یا گیرو سے رنگے ہوئے تھے۔ گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ آرتیاں اتاری جا رہی تھیں۔ اور صندل کے دھوئیں سے سارا عیش باغ مہک رہا تھا۔ اچانک صندل کی خوشبو میں کیوڑے، گلاب، اگر اور عنبر کی خوشبوئیں بھی شامل ہوگئیں اور سادھوؤں نے دیکھا کہ عیش باغ کے پوربی پھاٹک سے خوشبوؤں کے دھوئیں میں لپٹی ہوئی شاہی سواری اندر آ رہی ہے۔ موتی جھیل کے کنارے پہنچ کر سواری کے ساتھ کے سب لوگ رک گئے۔ ان کے بیچ سے واجد علی شاہ ایک خوبصورت سجے ہوئے گھوڑے پر سوار نکلے انہوں نے

موتی جھیل کا ایک چکر لگایا پھر ایک اور چکر لگایا۔ وہ بالکل چپ چاپ ایک ایک کٹی پر نظر ڈالتے آگے بڑھ رہے تھے، اور تمام سادھو آنکھیں جھکائے خاموش کھڑے تھے۔ ان میں بہت سے ایسے تھے جو کسی بادشاہ کے درشن کرنے کو ثواب کا کام جانتے تھے، لیکن وہ یہ بھی جانتے تھے کہ بادشاہ کے چہرے کو نظر بھر کے دیکھنا بے ادبی کی بات سمجھی جاتی ہے جس پر سزا بھی ہو سکتی ہے۔ اس لئے کوئی کوئی سادھو ڈرتے ڈرتے کنکھیوں سے بادشاہ کی طرف دیکھتا بھی تو فوراً نظریں ہٹا لیا تھا۔

آخر بادشاہ ایک کٹی کے پاس پہنچ کر رک گئے۔ کٹی کے آگے ایک خوبصورت جوان سادھو سر جھکائے کھڑا تھا۔ بادشاہ نے جو خود بھی بہت خوبصورت تھے، اس کے بھبھوت ملے ہوئے بدن، اور سر کے بالوں کی لمبی جٹاؤں کو غور سے دیکھا، پھر بہت نرم آواز میں پوچھا:۔

"بیراگی ہو؟"

"ہاں دیالو۔"

"نام کیا ہے؟"

"کشن داس۔"

"سری کشن جی مہاراج کے بھگت ہو؟"

"ہاں، دیالو۔"

بادشاہ نے کہا

"ہم نے بھی کرشن لیلا لکھی ہے۔ وہ محل میں کھیلی بھی جاتی ہے۔"

اس کے بعد وہ دیر تک کرشن جی کے قصے سناتے رہے اور بیراگی حیرت سے ان کو دیکھتا رہا۔ وہ ... بھی بھول گیا تھا کہ بادشاہ کے چہرے پر نظر نہیں ڈالنا چاہئے۔ آخر اس نے کہا:۔

"آپ تو کوئی گیانی پنڈت معلوم ہوتے ہیں!"

"نہیں، بیراگی" بادشاہ نے کہا "ہم بھی سادھو ہیں، لیکن دنیا کے بندھنوں میں جکڑے ہوئے ہیں۔"

اتنی دیر میں وہاں پر سادھوؤں کی بھیڑ لگ گئی تھی اور بادشاہ ان کو بتا رہے تھے:۔

"جب ہم پیدا ہوئے تھے تو جیوتشیوں نے بتایا تھا کہ ہماری قسمت میں جوگی ہونا لکھا ہے تب سے آج تک ہماری ماتا جی ہم کو ہر سالگرہ کے دن جوگی بناتی ہیں۔"

پھر بادشاہ نے بتایا کہ وہ خود بھی قیصر باغ میں جوگیا میلا شروع کرنے والے ہیں اس کے بعد وہ واپس جانے کے لئے مڑنے لگے۔ اتنے میں ایک بہت بوڑھا جوگی بھیڑ میں سے نکل کر آگے بڑھا۔ بادشاہ سے

قریب پہنچ کر اس نے ہاتھ جوڑے اور کہا۔

"مہابلی، ہمارے سوبھاگیہ سے آپ یہاں پدھارے۔ اب ہماری ایک پرارتھنا ہے کہ ہم سب کو اپنے درشن کرادیں۔"

بادشاہ نے مسکرا کر کہا۔

"جوگی جی ہم تو خود آپ سب کے درشن کرنے آئے تھے، مگر خیر۔"

یہ کہہ کر انہوں نے اپنے گھوڑے کی سنہری لگام کو ہلکے سے ہلایا، اور ایک بار پھر موتی جھیل کا چکر لگایا، اور اس بار سب سادھوؤں نے جی بھر کے انہیں دیکھا۔ پھر بادشاہ سواری کے جلوس میں جاملے اور کچھ دیر میں جلوس عیش باغ کے پھاٹک سے باہر نکل گیا، لیکن دو تین شاہی افسر، دس بارہ نوکر اور کئی بڑے بڑے صندوق عیش باغ ہی میں رہ گئے۔ افسروں نے بتایا کہ بادشاہ حکم دے گئے ہیں کہ ہر سادھو کو پانچ پانچ روپے ان کی طرف سے دان کرانے کے لئے دیئے جائیں۔

رات گئے تک عیش باغ میں سکوں کی جھنکار سنائی دیتی رہی۔

(۳)

اسی رات مہاراجا بال کشن واجد علی شاہ کے دربار میں ڈرتے ڈرتے پہنچے کچھ دیر میں دربار سج گیا۔ بادشاہ محل سے آکر تخت پر بیٹھے۔ علی نقی خان تخت کے ایک طرف سینے پر ہاتھ باندھے ادب سے کھڑے تھے۔ دوسرے درباریوں سے ایک دو باتیں کرنے کے بعد بادشاہ نے مہاراجا بال کشن کو اپنے سامنے بلوایا، کچھ دیر غور سے ان کو دیکھتے رہے پھر بولے۔

"راجا، آج ہم تمہارا میلا دیکھنے عیش باغ گئے تھے۔"

مہاراجا نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"خداوندِ نعمت، یہ میلا مہاراجا ٹکیت رائے کے زمانے سے چلا آرہا ہے۔"

"مگر تم نے اسے بہت بڑھادیا ہے۔ ہزاروں سادھو آجاتے ہیں، اور ہم نے سنا ہے تم چار مہینے تک سب کو اپنے پاس سے کھلاتے ہو۔"

مہاراجا کے ماتھے پر پسینا آگیا۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ بادشاہ کی بات کا کیا جواب دیں اتنے میں انہیں بادشاہ کی آواز سنائی دی۔

"راجا، ہم تمہارے اس کام سے جتنا خوش ہوئے اتنا کسی کام سے نہیں ہوئے تھے۔"

کچھ دیر تک درباری خاموش رہے پھر بادشاہ نے اپنے وزیراعظم کی طرف دیکھا، آہستہ سے

مسکرائے اور بولے:۔

"یہ سب سادھو ہمارے شہر میں آتے ہیں اور ہمارے باغ میں رہتے ہیں۔ پھر تو وہ ہمارے مہمان ہوئے۔ کیوں حضورِ عالم؟"

"بے شک، سلطانِ عالم،" علی نقی خان کو کہنا پڑا "بے شک، بے شک۔"

"تو پھر ان کی مہمانی کا بوجھ راجا کی جیب پر نہیں پڑنا چاہئے۔ اب سے ہر سال کا یہ سارا خرچ ہمارے خزانے سے دلوایئے۔"

یہ کہہ کر بادشاہ آرام کرنے چلے گئے۔

(۴)

قریب چالیس سال گذر گئے۔ درگا پوجا کا زمانہ تھا۔ کلکتے کے ایک بڑے مندر کے باغ میں دور دور سے آئے ہوئے کچھ سادھو بیٹھے ہوئے مندر کے پجاری سے ادھر ادھر کی باتیں کر رہے تھے۔ ان میں کئی سادھو شاہی کے زمانے میں لکھنؤ کے عیش باغ میں واجد علی شاہ کے مہمان رہ چکے تھے۔ وہ اس پر افسوس کر رہے تھے کہ پورے ہندوستان کو ہڑپ کر لینے کے بعد اودھ کی سلطنت پر بھی انگریزوں نے قبضہ کر لیا اور لکھنؤ کو ویران کر دیا۔ پجاری نے بتایا کہ سلطنت چھن جانے کے بعد سے واجد علی شاہ کو کلکتے ہی کے ایک محلے مٹیا برج میں رکھا گیا ہے اور آج کل وہ بیمار ہیں۔

"یہاں، کلکتے میں، اس کے بن باس کو تیس (۳۰) برس سے اوپر ہو گئے" پجاری کہنے لگا "اس کی بادشاہی نہیں رہی تو کیا ہوا، وہ تو ہے وہ ہمارے دیس کا آخری بادشاہ ہے۔" پھر پجاری نے لیک ٹھنڈی سانس بھری اور بولا، "اس کے بعد کسی بادشاہ کے درشن نہیں ہوں گے۔"

یہ سنتے ہی ایک بوڑھا سادھو اٹھ کھڑا ہوا۔

"مٹیا برج کا راستہ کدھر ہے؟" اس نے پجاری سے پوچھا "یہاں آئے ہیں تو بادشاہ کے درشن بھی کرتے چلیں۔"

پجاری نے اسے راستہ اچھی طرح سمجھا دیا اور بولا:۔

"بادشاہ بیماری میں بھی شام کو سیر کرنے نکلتے ہیں۔ اسی سمے درشن ہو سکتے ہیں۔"

○

شام کو وہ بوڑھا سادھو مٹیا برج میں واجد علی شاہ کے بنوائے ہوئے امام باڑے سبطین آباد کے پھاٹک کے سامنے والی سڑک پر ایک کنارے کھڑا ہوا تھا۔ بازار والوں کی باتوں سے اسے معلوم ہو گیا تھا کہ

د شاہ سیر سے واپس آنے والے ہیں اور اسی پھاٹک پر اتریں گے۔ سادھو کے آس پاس اور لوگ بھی
د شاہ کو دیکھنے کے لئے اکٹھا ہو گئے تھے کچھ دیر میں شاہی سواری کا چھوٹا سا جلوس آتا دکھائی دیا۔ سواری
یب سے گذری تو سادھو نے بادشاہ کو غور سے دیکھا وہ بڑھاپے میں بہت شان دار اور خوبصورت معلوم ہو
ہے تھے۔ ان کے پپوٹے سوجے سے تھے لیکن ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ سواری سادھو کے
امنے سے گذر گئی پھاٹک کے پاس بادشاہ کو کئی لوگوں نے سہارا دے کر سواری سے اتارا لیکن پھاٹک میں
خل ہونے کے بجائے بادشاہ مڑے اور سہارا دینے والوں کو پیچھے چھوڑ کر اکیلے ہی آہستہ آہستہ چلتے ہوئے
مجمع کی طرف بڑھنے لگے جو ان کو دیکھنے کے لئے اکٹھا ہو گیا تھا۔ یہ شاید نئی بات تھی اس لئے کہ بادشاہ کو
تے دیکھ کر سارا مجمع تتر بتر ہو گیا۔ صرف سادھو اپنی جگہ کھڑا رہا یہاں تک کہ بادشاہ اس کے بالکل قریب
ج گئے سادھو ہاتھ جوڑ کر جھک گیا اور بادشاہ نے کہا۔

"تم کب آئے کشن داس بیراگی؟"

سادھو کچھ دیر تک گم سم رہا، پھر گھٹی ہوئی آواز میں بولا۔

"مہابلی، آپ نے مجھے پہچان لیا!؟"

"بھلا ہم اپنے مہمانوں کو نہیں پہچانیں گے؟" بادشاہ نے کہا، کچھ رکے، پھر بولے "بیراگی، اس
ا، عیش باغ میں جب ہم بادشاہ تھے تب تو تم نے ہم کو دیالو کہا تھا۔ اب ہم بادشاہ نہیں ہیں، پھر ہم کو
بلی کیوں کہتے ہو؟"

"مہابلی" بیراگی بولا "بادشاہ تو آدمی کا دل ہوتا ہے آپ بادشاہ ہیں اور سدا بادشاہ رہیں گے۔
ن ہر بادشاہ دیالو نہیں ہوتا۔ آپ دیالو بھی ہیں اور مہابلی بھی۔"

اتنی دیر میں بادشاہ کو سہارا دینے والے لوگ قریب آ گئے تھے لیکن بادشاہ وہیں پر کھڑے کھڑے
لی سے اس کے سفر کا حال پوچھتے رہے۔ جب بیراگی نے بتایا کہ وہ آج ہی رات کو کلکتے سے واپس جا رہا
تو بادشاہ نے پوچھا۔

"ہمارے مہمان نہیں ہو گے؟" پھر بولے "مگر اب تو ہم خود بھی فقیر ہیں۔" اس کے بعد
ں نے بڑے موتیوں والا ایک ہار اپنے گلے سے اتار کر بیراگی کی طرف بڑھایا۔

اسے ہماری طرف سے دان کر دینا۔"

بیراگی نے ہار کو دونوں ہاتھوں میں لے کر آنکھوں سے لگایا۔ بادشاہ مڑے اور کئی لوگوں کا سہارا لئے
رے دھیرے چلتے ہوئے سبطین آباد کے پھاٹک میں داخل ہو گئے۔

لمبے اور تھکا دینے والے سفر کے بعد جب کشن داس بیراگی اپنے مٹھ پر واپس پہنچا تو اس کے چیلوں نے اسے خبر دی کہ کلکتے میں اودھ کے بادشاہ واجد علی شاہ کا انتقال ہو گیا ہے۔ بیراگی یہ خبر سن کر کچھ نہیں بولا۔ لیکن تین دن تک وہ اپنی کٹی سے باہر نہیں نکلا چوتھے دن چیلوں نے دیکھا کہ بیراگی مرا پڑا ہے۔ اس کی آنکھوں پر بڑے موتیوں کا ایک ہار رکھا ہوا تھا۔ ہار کے کچھ دانوں پر بیراگی کے آنسو چھوٹے چھوٹے موتیوں کی طرح چمک رہے تھے۔

○

کھارادر کراچی سے جبین فاطمہ کا انتخاب۔

سیانا کوا؟

ایک پیاسے کوّے کو ایک جگہ پانی کا مٹکا پڑا نظر آیا۔ بہت خوش ہوا کیوں کہ پیاسا تھا۔ لیکن یہ دیکھ کر مایوس ہوا کہ پانی بہت نیچے مٹکے کی تہہ میں تھوڑا سا ہے۔ سوال یہ تھا کہ پانی کو اوپر کیسے لائے؟

اتفاق سے اس نے حکایات لقمان پڑھ رکھی تھی۔ پاس ہی بہت سے کنکر پڑے تھے۔ کوے نے کنکر اس میں ڈالنا شروع کر دیئے۔ کنکر ڈالتے ڈالتے صبح سے شام ہو گئی۔ پیاسا تو تھا ہی اور نڈھال ہو گیا۔ مٹکے کے اندر نظر ڈالی تو کیا دیکھتا ہے کہ کنکر ہی کنکر ہیں۔ سارا کا سارا پانی کنکروں نے ہی پی لیا ہے۔ پھر وہ بے سدھ ہو کر زمین پر گر گیا اور مر گیا، اگر وہ کوّا کہیں سے ایک نلکی لے آتا تو مٹکے کے منہ پر بیٹھا بیٹھا پانی چوس لیتا اور اپنے دل کی بھڑاس نکال پاتا اور بے چارہ ہرگز جان سے نہ جاتا۔

(ابن انشاء کی تخلیق "اردو کی آخری کتاب" سے اقتباس)

وقت

فضل ربی راہی ...... منگورہ

تیز کتنی وقت کی رفتار ہے
بھاگنے کو یہ سدا تیّار ہے
وقت کو ہر وقت لاؤ کام میں
یہ گزرنے میں بہت طرّار ہے
کون گزرا وقت لا سکتا ہے پھر ؟
اس میں ہر اک شخص ہی لاچار ہے
کام میں لایا ہے جو بھی وقت کو
یوں سمجھ لو اس کا بیڑا پار ہے
قدر جس کو وقت کی ہوتی نہیں
وہ مسائل سے سدا دوچار ہے
قدر کرتا ہے جو راؔہی وقت کی
کام یابی کو اسی سے پیار ہے

کہانیاں

شیخ عبدالقادر اردو کے نامور ادیب اور مشہور رسالہ "مخزن" کے مدیر تھے۔ انہوں نے بچوں کے لئے یہ مضمون آج سے تقریباً پون صدی پہلے لکھا تھا جو قارئین آنکھ مچولی کے مطالعے کے لئے پیش کیا جارہا ہے۔ (ادارہ)

کہانی!..... ہائے بچپن میں اس لفظ سے کتنی محبت ہوتی ہے۔ آنکھ کھولتے ہی چڑیا پر۔ گھر کی پالی ہوئی بلی پر۔ اور ان چوہوں پر جو بلی کا شکار ہوتے ہیں نظر پڑتی ہے۔ اور بے خبری کی حالت میں ایک لگاؤ ان جانوروں سے پیدا ہوتا ہے۔ کبھی کبھی صحن میں نکل کر اگر بیٹھتے ہیں۔ تو منڈیر پر کوّا نظر آتا ہے اور اس کی کائیں کائیں کی آواز کان میں پڑتی ہے۔ اگر گھر میں کوئی درخت ہو تو اس پر کبھی کبھی فاختہ آکر کُو کُو

گُو گُو کرتی ہے اور ہمارے ننھے سے دل کو بہلاتی ہے۔ کبھی کوئی کبوتر اپنی اڑان کی شان دکھاتا ہوا گزر جاتا ہے۔ بس ماں باپ بہن بھائی کی ہمیشہ حاضر رہنے والی صورتوں کو چھوڑ کر یہی اپنا جہان ہیں۔ اور بچپن اسی میں رہتا ہے۔ ان کے حالات سے دلچسپی پیدا ہوتی ہے۔ ہم آپ دودھ پیتے ہیں۔ پینے کے لئے ضد کرتے ہیں۔ روتے ہیں۔ تو دل ہی دل میں خیال آتا ہے۔ کہ چڑیا کے بچے بھی اسی طرح اپنی ماں سے دودھ مانگتے ہوں گے۔ کبھی ہمیں اماں جان خفا ہوتی ہیں تو سوچتے ہیں کہ اسی طرح چڑیا بھی اپنے بچوں سے بگڑتی ہوگی۔ کبھی گھر کی مامااپنے شریر لڑکے کو پیٹتی ہے تو جی میں آتی ہے کہ کبھی چڑیا کے شریر بچے بھی اسی طرح پٹتے ہونگے۔ یہ خیالات ہم دل ہی میں رکھتے ہیں۔ اول تو ابھی بولنا ہی کہاں آتا ہے۔ اور اگر آئے بھی تو یہ ڈر لگتا ہے کہ کوئی ہماری بات پر ہنس نہ دے نہ جانے کیا سمجھے۔ اور اگر یہ جرأت بھی ہو جائے تو یہ کس کا جی چاہتا ہے۔ کہ اپنی پیاری دنیا کے دلکش قصے جن سے اپنا جی بہلتا ہے۔ خواہ مخواہ اوروں کو سنائے۔ اگر فطرت انسانی کے مطالعہ کرنے والی مائیں اور دائیاں اور خالائیں ہمارے خیالات کو بھانپ جاتی ہیں اور چڑیا چڑے کی ایسی پیاری پیاری اور بھولی بھولی کہانیاں سناتی ہیں کہ دل لوٹ جاتا ہے اور ہم پوچھتے ہیں۔ ''اماں جان تو کیا چڑیا بھی باتیں کرتی ہے؟''

ماں۔ ''ہاں بیٹا۔ اور نہیں کیا۔ باتیں نہیں کرتی تو بچوں کو بلاتی کیسے ہے۔'' بیٹا۔ ''تو اماں جان! ہم اس کی باتیں کیوں نہیں سمجھتے۔ ہمیں تو یونہی چیں چیں سی آواز سنائی دیتی ہے۔''

ماں۔ ''بیٹا ان کی بولی اور ہے۔ جانوروں کی بولیاں جانور ہی سمجھتے ہیں۔''

بیٹا۔ ''کوئی آدمی بھی ان کی بولی سمجھ سکتا ہے؟''

ماں۔ ''خدا جانے۔ کوئی سیانے سمجھتے ہونگے۔''

بیٹا۔ ''اماں جان۔ خدا کون ہے؟ تم اکثر اس کا نام لیتی ہو۔''

ماں۔ بیٹا تم ابھی بچے ہو۔ نادان ہو۔ اس کو نہیں سمجھتے۔ بس سو جاؤ۔ لو میں تم کو لوری دے کر سلاتی ہوں۔ کل اور اچھی سی کہانی چڑیا کی سناؤں گی۔ اچھے میرے بیٹے!''

بس ہم سو جاتے ہیں۔ دوسرے دن کی کہانی میں چڑیا کے بچوں کو بلی کھا جاتی ہے۔ اور چڑیا بچاری روتی رہ جاتی ہے۔ بلی پر بڑا غصہ آتا ہے۔ جی میں آتی ہے۔ کہ کل اٹھتے ہی بلی کی خبر لینگے۔ پھر سوچتے ہیں کہ اس بلی کا کیا قصور۔ یہ تو ہمارے گھر کی ہے۔ اور یہ تو چڑیا کے بچے نہیں کھاتی۔ پھر ڈر سا بھی آتا ہے کہ کہیں ہمیں ہی پنجہ سے زخمی نہ کر دے۔ اس سے اگلی رات پھر وہی کہانی کی فرمائش ہوتی ہے۔ اس میں کوّے میاں کا بھی ذکر آ جاتا ہے۔ دوسرے دن اس مکار کی شکل خاص غور سے ملاحظہ کی جاتی ہے۔ کہ یہ انڈے چرا لے جاتا ہے۔'' اور اگر ہاتھوں میں سکت آ گئی ہے تو ایک کنکر بھی اس کے رسید ہوتا ہے۔ وہ

اڑ کے اور پرے جا بیٹھتا ہے۔ ایک بڑی سی لکڑی ڈھونڈھ کے لائی جاتی ہے۔ وہ ارادے بھانپ جاتا ہے اور اڑ جاتا ہے۔ فاختہ سے انس پیدا ہوتا ہے۔ اور کسی موقع پر اماں جان سے فرمائش ہوتی ہے۔ کہ کوئی فاختہ کی بات سنائیں۔ اس کی صفائی۔ اس کی نفاست اور خدا کے یاد کرتے رہنے کی داستان سننے میں آتی ہے۔ اور اس سے اور پیار بڑھتا ہے۔ جی چاہتا ہے۔ کہ اگر ہم خود پردار ہوں تو فاختہ سے چل کر باتیں کریں۔ اس کے ساتھ گُو گُو کریں۔ مگر یہ حالت کہاں نصیب!۔ اڑنے کا ارادہ کریں تو زمین سے جکڑے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ اچھلتے ہیں اور پھر زمین پر آ رہتے ہیں۔ اور اچھلتے کتنا ہیں۔ اتنا بھی تو نہیں جتنا خود ہمارے ہاتھ کا اچھالا ہوا گیند۔ اتنے میں کھیلتے کھیلتے گلی میں جا نکلتے ہیں۔ ایک کالی کلوٹی عورت ایک لال سی چیز بیچتی ہے۔ جس میں منہ کے پاس رکھ کر پھونک دو تو گُو گُو گُو۔ کی سی آواز نکلتی ہے۔ جھٹ گھر سے آٹا لے جا کر اسے دیتے ہیں اور وہ قیمتی چیز مول لیتے ہیں۔ اوپر فاختہ بیٹھی گُو گُو کرتی ہے۔ نیچے ہم اس کی نقل اتارتے ہیں۔ چلو یارانہ کا کچھ سلسلہ تو ملا۔ مشق یہاں تک مدد دیتی ہے کہ فاختہ کو دھوکہ ہونے لگتا ہے۔ وہ سمجھتی ہے کہ کوئی اس کا ہم جنس کہیں بول رہا ہے۔ اور زور سے بولتی ہے۔ ہم اور زور سے بولتے ہیں۔ رشتہ تو پیدا ہوا۔ دور کا ہی سہی۔ غرض اس طرح یہ سچی خوشی کے دن گزرتے جاتے ہیں۔ آخر یہ جانوروں کی کہانیاں پھیکی معلوم ہونے لگتی ہیں۔ نبض شناس مائیں آدمیوں کی کہانیاں سنانے لگتی ہیں۔ ان میں تو وہ مزا آتا ہے۔ کہ دیوانے ہو جاتے ہیں۔ جو باتیں رات کو سنتے ہیں۔ وہ دن کو اپنے ہم عمروں میں بیٹھ کر دہراتے ہیں۔ اور رات کو نت نئی کہانی کے خواستگار ہوتے ہیں۔ دل بے چین رہتا ہے کہ کب رات ہو اور پھر کہانی سنیں۔ شام ہی سے کھانا جلدی جلدی کھا کر تقاضا شروع کر دیتے ہیں۔ اماں جان ہیں کہ گھر کے کام کاج سے فارغ ہونے میں نہیں آتیں۔ ایک ایک گھڑی پہاڑ معلوم ہوتی ہے۔ بہ مشکل وہ بچھونا بچھاتی ہیں اور ہم پہلے ہی سے لیٹ جاتے ہیں۔ کہ کہانی سنکر اپنے بچھونے پر جائینگے۔ آخر ان کا ذخیرہ ختم ہوتا ہے۔ اور وہ گھبرا گھبرا کر اور خفا ہو کر جواب دینے لگتی ہیں۔ یا کبھی پیار سے کہتی ہیں۔ "بیٹا اب تم بڑے ہو چلے ہو۔ مدرسے جایا کرو۔ اور جلدی جلدی الف بے تے ختم کر کے اردو کی کتابیں پڑھنے لگو۔ جب پڑھنا آجائیگا تو کتابوں میں ایسی ایسی کہانیاں ہیں کہ یہ کہانیاں بھول جاؤ گے۔" پہلے تو خیال آتا ہے کہ اس سے اچھی، اس سے مزیدار، اور کیا کہانیاں ہونگی۔ پھر رفتہ رفتہ پڑھنے کے ساتھ کچھ بات سمجھ میں آنے لگتی ہے۔ اور نوبت بڑے بڑے قصوں اور فسانوں اور ناولوں تک پہنچتی ہے۔ پھر اس زمانہ کی تو کچھ نہ پوچھئے۔ اس دنیا سے جدا ایک نئی دنیا اپنے لئے بساتے ہیں۔ اس میں جو لوگ رہتے سہتے ہیں۔ ان سے رشتہ جوڑتے ہیں۔ ان کی خوشی دیکھ کر کھلکھلا کر ہنس پڑتے ہیں۔ حالانکہ اکیلے بیٹھے ہیں اور کتاب سامنے ہے۔ ان کے

رنج سے رنجیدہ ہوتے ہیں۔ ان کی مصیبت کا سماں آنکھوں کے سامنے آتے ہی ہمارے آنسو ٹپ ٹپ گر پڑتے ہیں۔ اور اماں جان۔ یہ حالت دیکھ کر غصے سے کتاب چھین کر چھپا دیتی ہیں۔ ''آگ لگے ان نگوڑی کہانیوں کو۔ نہ حساب نہ کتاب، نہ لکھائی۔ نہ پڑھائی۔ بس دن رات یہ ہو اور کہانیاں ہوں۔ اور مفت میں انہیں پڑھ پڑھ کر دماغ تھکائے۔ سڑی سودائیوں کی طرح ہنس دے اور دیوانوں کی طرح رو رو کر ہلکان ہو۔ میں باز آئی تیرے ایسے پڑھنے سے۔ آلینے دے میاں کو دیکھ تو کیسی شامت آتی ہے''۔ اس وقت تو سر جھکا کے چپ ہو رہے۔ ذرا نظر بچی اور پھر ہم ہیں اور ہماری نئی دنیا۔ ہماری مرغوب دنیا۔ ہماری پیاری دنیا۔ آخر یہ سودا بھی پہلے شوقوں کی طرح کم ہوتا ہے۔ اور کچھ ماں کی خفگی۔ کچھ باپ کا ڈر۔ کچھ استاد کی اصلاح۔ کچھ مدرسہ اور امتحان کا فکر۔ اور سب سے بڑھ کر اپنی طبع سلیم یہ سکھاتی ہے کہ وقت کا زیادہ حصہ ضروری درسی خواندگی میں صرف کر کے اگر کچھ وقت بچے تو دل بہلانے کو کوئی قصہ کہانی بھی پڑھ لیا کرو۔ بس اس رفتار میں استقلال پیدا ہو جاتا ہے۔ اور ویسے۔ یہ چاٹ تو ایسے لگتی ہے کہ عمر بھی نہیں چھٹتی۔ صرف مذاق کی قسم بدلتی جاتی ہے۔ طفولیت میں طلسمات اور داستانیں۔ دیوپری کے قصے۔ جادو کے قلعے۔ اور نقوش سلیمانی مزے دیتے ہیں۔ جوانی میں حسن و عشق کے بیان دل کو لبھاتے ہیں۔ ذرا اور بڑھے اور ناولوں اور فسانوں میں مطلب خیزی اور نتائج نیک کی تلاش ہونے لگی۔ ذرا اور بوڑھے ہوئے تو دماغ نے فلسفہ میں ملے ہوئے ناول ڈھونڈھنے شروع کئے۔ اس سے بالاتر ہوئے۔ تو تواریخ و سیر کی کتابوں میں ناول کا مزا پانے لگے۔ مگر یہ بات کچھ انسان کی فطرت میں ہے۔ کہ دوسروں کے واقعات اور حادثات۔ کامیابی اور ناکامی۔ دلیری اور بزدلی کی روائتوں کو ایک خاص ہمدردی اور دلچسپی سے سنتا اور پڑھتا ہے۔ مگر یہ ہر شخص کی طبیعت میں نہیں، کہ ان قصوں اور کہانیوں سے اپنے مفید نتیجے نکالے۔ اور اپنے مطالعہ کے اس حصے کو بیکار نہ جانے دے۔ مبارک ہیں وہ بچے جو کہانیاں سنتے ہوئے اپنے واسطے اچھے اچھے سبق ڈھونڈھتے ہیں۔ جہاں کسی کی برائی کا حل سنتے ہیں تو اس سے عبرت پکڑتے ہیں اور جہاں بھلائی کا بیان پڑھتے ہیں تو اس کی پیروی کرنا چاہتے ہیں۔ جہاں کسی بُرے پر پھٹکار برستی دیکھتے ہیں۔ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے اپنی عمر میں برائی کی تو ان کا بھی وہی حال ہو گا۔ اور جہاں کسی نیک کی تعریفیں سنتے ہیں۔ جانتے ہیں کہ اگر انہوں نے اپنی عمر میں نیکی کی تو انہیں بھی لوگ بھلے سے یاد رکھیں گے۔ کیونکہ اگر غور کرو۔ تو ہم میں سے ہر ایک شخص کی زندگی ایک نہائت دلچسپ کہانی ہے۔ جس میں دنیا کے ایک حصہ کو۔ خواہ وہ کتنا ہی مختصر کیوں نہ ہو۔ اس سے بہت زیادہ دلچسپی ہے۔ جتنی ہمیں ان خیالی قصوں سے ہوتی ہے۔ جنہیں ہم بچپن میں سن سن کر خوش ہوتے ہیں۔ اور اگر ہم اچھی زندگی بسر کر جائینگے تو ہماری کہانیاں بھی دنیا میں رہینگی۔ اور ہمارے بعد کی نسلیں انہیں سن سن کو خوش ہوں گی۔

ڈنڈا ڈولی

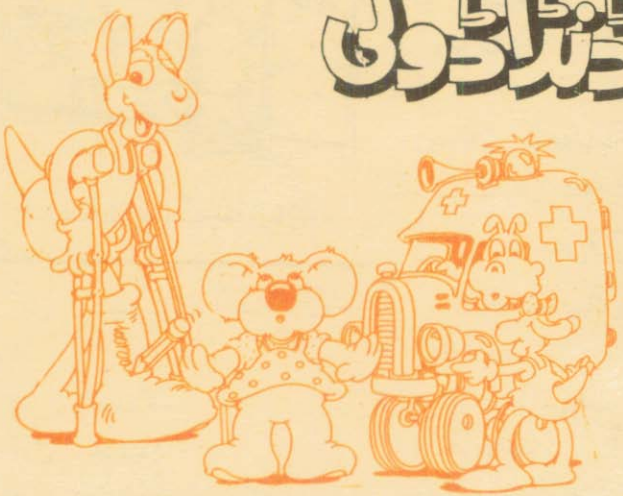

انعامی لطیفہ

استاد نے بچوں سے پوچھا کہ ! "دودھ کو خراب ہونے سے بچانے کا آسان طریقہ کیا ہے۔"

ایک بچے نے کہا! "اسے گائے کے پیٹ میں ہی رہنے دیا جائے۔"

خواجہ اعزاز احسن۔ اسلام آباد

بڑا بھائی ..... "دیکھئے ابا جان یہ خالد میرے پیچھے سایہ کی طرح لگا ہوا ہے، ہر جگہ میرا پیچھا کرتا ہے۔"

خالد ..... "جی ابا جی ..... آپ ہی نے تو کہا تھا کہ بڑوں کے نقش قدم پر چلا کرو۔ میں آج بھائی جان کے پیچھے چلتا ہوا سینما پہنچ گیا۔"

نوید اختر، کراچی۔

بیٹا (باپ سے) "ابو کل ہم بہت مالدار ہو جائیں گے۔"

باپ ..... "وہ کیسے؟"

بیٹا ..... "ابو کل ماسٹر صاحب ہمیں پیسوں سے روپے بنانے کا طریقہ بتائیں گے۔"

راجہ نعمان۔ جھڈو

ہمارے ہاں اندھوں کے چشمے نہیں بنتے۔

آدمی..... (ایک بچے سے) تمہارا خاندان کونسا ہے؟

بچہ..... جانوروں کا۔

آدمی..... وہ کیسے؟

بچہ..... میری امی مجھے الو کہتی ہیں۔ ابا جان گدھا کہتے ہیں۔ ماسٹر جی بھالو کہتے ہیں اور دادا جان شیر کہتے ہیں۔

روبینہ ناز، مخدوم پور

بچّے نے والد سے پوچھا "کیا یہ صحیح ہے کہ والدین کا علم بچوں سے زیادہ ہوتا ہے؟"

"بالکل!" باپ نے جواب دیا۔

"اچھا یہ بتائیں کہ موٹر سائیکل کس نے ایجاد کی؟"

"ڈائملر نے" باپ نے کہا۔

"تو پھر موٹر سائیکل ڈائملر کے والد نے کیوں نہیں ایجاد کی"؟ بچے نے پوچھا۔

صولت رعنا۔ راولپنڈی

ایک شکاری (دوسرے شکاری سے) "میں نے شیر کو چیر پھاڑ دیا، ہاتھی کو سونڈ سے پکڑ کر نیچے پٹخ دیا، گینڈے کو مکا مار کر ڈھیر کر دیا۔

دوسرا شکاری..... (حیرت سے) "پھر کیا ہوا؟"

پہلا شکاری..... "ہونا کیا تھا کھلونوں کی دکان کے مالک نے مجھے دکان سے باہر پھینک دیا۔"

مظفر حسین قریشی۔ میرپور خاص

دو دوست مسجد میں باتیں کر رہے تھے۔

پہلا دوست..... نماز پڑھتے وقت جوتے آگے ہوں تو نماز نہیں ہوتی۔

دوسرا دوست..... اگر نماز پڑھتے وقت جوتے پیچھے ہوں تو پھر جوتے نہیں ہوتے۔

گل محمد عبداللطیف کھتری۔ کراچی

ایک سائیکل سوار کا بچہ زور زور سے رو رہا تھا۔

کسی نے سائیکل سوار کو روک کر پوچھا۔ تمہارا بچہ رو رہا ہے اور تمہیں کوئی پروا نہیں۔

سائیکل سوار نے جواب دیا۔ میں نے اسے خود رلایا ہے کیوں کہ میری سائیکل کی گھنٹی نہیں ہے۔

ریحانہ شکیل۔ کراچی

باپ نے بیٹے کو مارنے کے بعد کہا کہ بیٹا! میں تمہیں اس لئے مارتا ہوں کہ مجھے تم سے محبت ہے۔

بیٹے نے جواب دیا! کاش میں بھی آپ کی محبت

کا جواب محبت سے دے سکتا۔

ایم اے جاوید۔ لاہور

"وجاہت جب بھی میں جماعت کے کمرے میں آتا ہوں تم اپنے کان میں انگلی ڈال لیتے ہو"، استاد نے شاگرد سے پوچھا" مجھے بتاؤ تم انگلی کیوں ڈالتے ہو؟"

وجاہت .... جناب وہ اس لئے کہ آپ کی بات ایک کان سے داخل ہو کر دوسرے سے نہ نکل جائے۔"

محمد قمر محمود۔ سکھر

مالک (مزدور سے) "سب مزدور دو بورے اٹھا کر لے جارہے ہیں اور تم نے ایک بورا اٹھا رکھا ہے، کیوں؟"

مزدور۔ "جناب وہ سب ست اور کاہل ہیں۔ وہ دوسرا پھیرا لگانے سے گھبراتے ہیں۔"

ثاقب ندیم احمد ...... کراچی

ایک نوجوان انٹرویو دینے کے لئے ایک فرم میں گیا۔ باس نے اس سے پوچھا "اس سے پہلے تم کیا کام کرتے تھے؟"

امیدوار نے کہا "میں اپنے بھائی کے کام میں ہاتھ بٹاتا تھا۔"

"تمہارا بھائی کیا کام کرتا ہے؟" باس نے پوچھا "وہ ! وہ جی نوکری تلاش کر رہا ہے۔" لڑکے نے جواب دیا۔

لبنیٰ فریال ...... کراچی

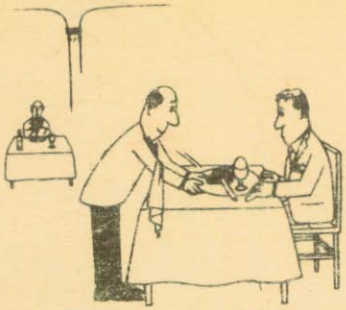

کچھ زیادہ بوائل ہو گیا ہے سر، شاید ہتھوڑی کی ضرورت پیش آجائے۔

ایک شخص دوپہر کو اپنے ایک کاہل دوست سے ملنے اس کے گھر گیا تو وہ سویا ہوا ملا اس کے آنے پر وہ اٹھ گیا باتوں کے دوران آنے والے دوست نے کہا۔

"ماہرین کے مطابق ایک آدمی کو دن میں اوسطاً سات گھنٹے سونا چاہئے، تم کتنا سوتے ہو؟"

"چار گھنٹے" دوست نے آنکھیں ملتے ہوئے جواب دیا۔

"چار گھنٹے؟ یہ تو بہت کم ہیں۔" پہلے دوست نے کہا۔

"ہاں یار"!! باقی میں رات کو سوتا ہوں۔" جواب ملا۔

محمد فرقان ...... کراچی

استاد (شاگرد سے) اگر تم مغرب میں مسلسل چلتے جاؤ تو کہاں پہنچو گے؟

شاگرد! جناب غروب ہو جاؤں گا۔

اکرم سیال توقیر وکیل والہ

صحیح طریقہ

کتے کو دو روز تک بھوکا رکھیں، پھر پانی میں غوطہ دیں، مچھلی بچ کر نہیں جا سکتی۔

ایک آدمی کتے کی زنجیر پکڑے ریلوے کاؤنٹر پر پہنچا۔ آدمی نے اپنا چہرہ کھڑکی سے نکال کر کلرک سے پوچھا۔

"جناب کیا میں کتے کا ٹکٹ لے کر سفر کروں؟"

کلرک نے حیرانی سے اسے دیکھا اور بولا "نہیں جناب ایسی کونسی بات ہے آپ انسانوں کے ٹکٹ پر ہی سفر کر سکتے ہیں"۔

سائرہ نقوی لاہور

مہمان ..... جب میں کھانے کی میز پر بیٹھتا ہوں تو یہ تمہاری بلی میرا منہ کیوں تکنے لگتی ہے۔

میزبان ..... بیچاری اپنا پیالہ پہچان لیتی ہے۔

(عمر فہیم خان ..... فیصل آباد)

معمر استانی نے استعفیٰ دے دیا اور اس کی وجہ یہ بیان کی "آج کل اساتذہ ہیڈ ماسٹر سے ڈرتے ہیں۔ ہیڈ ماسٹر انسپکٹر آف اسکولز سے ڈرتے ہیں۔ انسپکٹر محکمۂ تعلیم کے سربراہ سے ڈرتے ہیں۔ محکمۂ تعلیم والے بچوں کے والدین سے ڈرتے ہیں۔ والدین بچوں سے ڈرتے ہیں اور بچے کسی سے نہیں ڈرتے۔ لہٰذا مجھے ملازمت سے سبکدوش کیا جائے۔"

حارث شکیل ..... کراچی

ایک دفعہ ایک آدمی کے ہاں ایک بچہ ہوا وہاں پر اس وقت سب رشتہ دار موجود تھے بچے کے ماموں نے کہا کہ بچہ بالکل دادا پر گیا ہے۔ اس بچے کا بڑا بھائی جو کم از کم ۵ یا ۶ سال کا تھا اس نے کہا: اگر یہ دادا پر گیا ہے تو اس کی ڈاڑھی اور مونچھیں کہاں ہیں۔

عابیہ امتیاز، کراچی۔

"کیسی ناانصافی کی بات ہے" جیل کے اندر ایک قیدی نے دوسرے سے کہا، "میں پچھلی بار یہاں آیا تھا تو مجھے پڑھایا گیا، دستخط کرنے سکھائے گئے اور اب مجھے جعلی چیک پر صرف دستخط کرنے کے الزام میں پکڑ لیا گیا۔"

ناظمہ حسن خان زئی کراچی

میں پہلے نہ کہتا تھا، یہ اولمپک سے بھاگا ہوا لگتا ہے۔

اکوپنکچر اور مچھلیاں

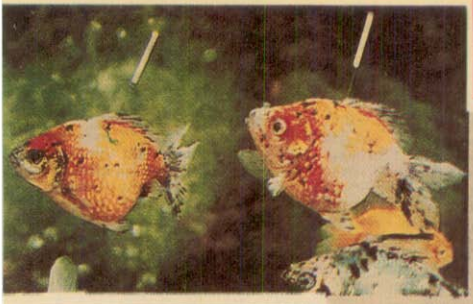

کیلی فورنیا کے اکوپنکچر کلینک میں کام کرنے والی خاتون "ڈولیسیا" نے ان دو بیمار مچھلیوں کا علاج سوئیوں کے ذریعہ کیا اور اللہ کے فضل سے مچھلیاں بھلی چنگی ہو گئیں،

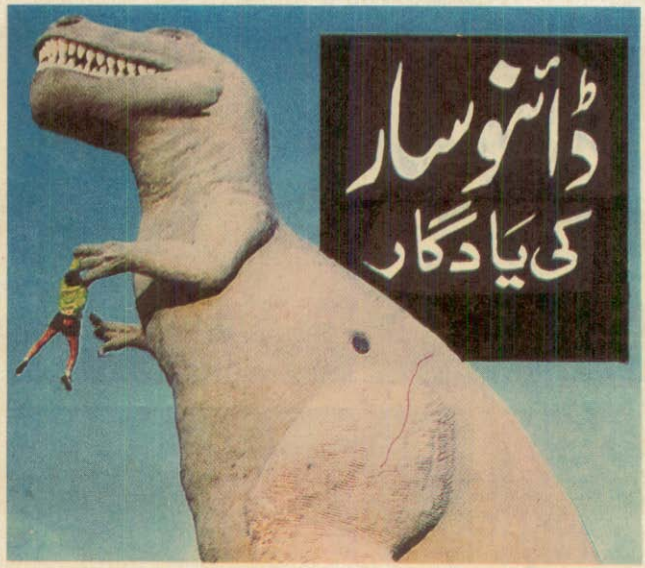

ڈائنوسار کی یادگار

لوہے اور کنکریٹ سے تیار کردہ ۴۰ فٹ بلند ڈائنوسار، جان ووڈ وارڈ کے تخیل کا شاہکار ہے
جان خود بھی چوٹیاں سر کرنے والا مہم جو ہے، اسے اپنے بناتے ہوئے ڈائنوسار کو سر کرنے میں بھی مزہ آتا ہے

ہمارے ہاں تو لڑکیاں چھپکلی سے بھی ڈر جاتی ہیں مگر نیو یارک کی ان 75 لڑکیوں کو دیکھئے
جنہوں نے ہوائی جہاز کے ذریعے فضا میں چھلانگ لگائی اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک حسین دائرہ'
خوش نما پھول سا بنا دیا۔ بعد میں یہ پیراشوٹ کے ذریعے بہ حفاظت زمین پر اُتر آئیں،

(شعبہ تحقیق و تلاش ماہنامہ آنکھ مچولی)

ایسے بھی DEER ویسے بھی DEAR

ایک امریکی کہانی

شاہنواز فاروقی

کورونا ڈو کے بھوت

جان نیلسن نے ٹریلر (بڑے ٹرک) کی کھڑکی سے گردن نکال کر وادی پر نظر ڈالی تو سورج کی شدید گرمی اور تیز روشنی نے فوراً ہی اس کو آنکھیں بند کر کے ٹریلر کے اندر محصور ہو جانے پر مجبور کر دیا۔ نیلسن کا دل یکایک خوف کے مارے دھڑکنے لگا۔ وہ اس وقت موت کی وادی میں تھے۔ جہاں ہر طرف گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ نیلسن اور اس کے ساتھیوں کے لئے یہ وادی بالکل اجنبی تھی کیونکہ وہ یہاں پہلی بار آئے تھے۔ اس وادی میں ان کے آنے کی وجہ سیاحت یا مہم جوئی کا شوق نہیں بلکہ ایک بڑے خزانے کی تلاش تھی۔ اس تلاش کے دوران ان کی پانی کی بڑی سی مشک میں سوراخ ہو گیا تھا جس کے باعث

انہیں رک کر اس سوراخ کو بند کرنا پڑا۔

نیلسن نے ٹریلر کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے بیٹھے گھوم کر ٹریلر کے پچھلے حصہ میں ایک ننھی سی کھڑکی کھول کر جھانکا۔ ٹریلر کے پچھلے حصہ میں اس وقت اس کا بیٹا رونی میز پر نقشے پھیلائے گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ ''ہم فول ویل سے کتنی دور ہیں؟'' نیلسن نے اپنے بیٹے سے پوچھا

''کوئی سو میل کے قریب ڈیڈی'' رونی نے لمحہ بھر میں حساب لگا کر بتایا۔

اسی اثناء میں رونی کے کزن چک ولیم نے جو خزانے کی تلاش پر نکلی ہوئی اس جماعت کا تیسرا رکن تھا پانی سے بھری ہوئی مشک کے سوراخ کو بند کر دیا تھا۔ اس وقت اس کے گنگنانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ انہی آوازوں کے دوران اس نے زور سے آواز لگائی ''چلیں صاحب کام ہو گیا۔''

اور تھوڑی دیر بعد ان کا ٹریلر اپنی منزل کی جانب روانہ ہو گیا۔ ''ہم کل دوپہر تک فول ویل پہنچ جائیں گے'' رونی نے چک سے کہا۔ چک نے جواب دیئے بغیر ہاں میں گردن ہلائی۔

اگلے روز وہ بلند و بالا پہاڑیوں سے گھری ہوئی وادی میں موجود تھے۔ ان کی زندگی کا سب سے اہم لمحہ کسی بھی وقت ان کے سامنے آ سکتا تھا۔ نیلسن نے ٹریلر سے اترتے ہی ایک دستاویز نکالی جس میں لکھا ہوا تھا کہ قدیم زمانے سے چاندی کی ایک کان اس بنجر وادی میں کہیں چھپی ہوئی ہے۔ اور کسی خوش قسمت کی منتظر ہے جو آ کر اسے دریافت کرے۔ ''ہمیں ایک بار پھر نقشہ کو غور سے دیکھ لینا چاہئے۔''

نیلسن نے چاندی کی کان کی تلاش سے قبل کہا اور پھر نقشہ کھول کر بولا ''اس میں لکھا ہے کہ ایک سوکھی ندی ایک سرنگ کے دہانے تک جاتی ہے۔ سرنگ کے دہانے کے پتھروں پر قدیم ہندوستانی باشندوں کی بنائی ہوئی کچھ تصاویر کندہ ہیں۔ خزانے کی کان یہیں کہیں ہے..... آئیں اب ہم اس خشک راستے کو تلاش کریں۔'' نیلسن نے یہ کہہ کر باقی دونوں ہمسفروں کی طرف دیکھا۔

وہ تینوں کئی گھنٹوں کی مسلسل اور تھکا دینے والی تلاش کے بعد بالآخر اس سوکھی ندی کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہو ہی گئے۔ یہ سوکھی ندی کبھی پانی سے بھری رہتی تھی مگر پھر رفتہ رفتہ جب اس علاقے میں بارشیں ہونی بند ہو گئیں تو یہ ندی خشک ہو گئی۔

وہ تینوں اس ندی کے ایک کنارے پر آگے بڑھتے رہے۔ وہ کوئی چھ سات کلو میٹر چلے ہوں گے کہ ندی اچانک ایک طرف کو مڑی ہوئی نظر آئی۔ ندی کے موڑ سے کوئی پچاس قدم کے فاصلے پر ایک سرنگ کی بلند و بالا دیوار کھڑی تھی۔ دیوار اور موڑ کے درمیان ندی غائب تھی گویا ندی موڑ تک آ کر ختم ہو جاتی

تھی۔ سورج کے غروب ہوتے ہوتے وہ سرنگ کے اس مقام تک پہنچ گئے جہاں سے سرنگ کی دیوار بہت بلندی کی طرف چلی گئی تھی۔ دیوار کے اوپر غروب ہوتے ہوئے سورج کی روشنی عجیب طرح کے رنگ دکھا رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد سورج غروب ہو گیا اور اندھیرا آدھمکا۔

"جلدی کریں" نیلسن نے کہا۔ "ہمارے پاس چائے کے لئے پانی کم ہے۔ میرا خیال ہے کہ ذرا اور آگے ایک چشمہ ہے۔" وہ لوگ جیسے ہی سرنگ میں داخل ہوئے انہیں گہری ٹھنڈک کا احساس ہوا۔ سرنگ کی دیواروں پر طرح طرح کی جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔

وہ جیسے ہی آگے بڑھے مدھم ہوا کے جھونکے ان تک پہنچنے لگے۔ پھر یہ جیسے جیسے آگے بڑھتے گئے ہوا کے جھونکے تیز شور میں تبدیل ہوتے گئے۔ بالآخر ایسا لگنے لگا جیسے بہت سی چڑیلیں ایک ساتھ مل کر چیخ رہی ہوں۔ "کیا تم بھوت پریت پر یقین رکھتے ہو۔ میں تو نہیں رکھتا" چک نے جیسے خود سے کہا۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد وہ سرنگ سے نکل کر ایک گول شکل کی وادی میں جا پہنچے۔ وادی میں پہنچتے ہی اگرچہ ہوا کی خوفناک آوازیں آنا بند ہو گئیں مگر انہوں نے دیکھا کہ وادی کے درمیان میں ایک بہت بڑا سا بگولہ رقص کر رہا ہے۔

"میرے خدا کیا یہاں ہر وقت ایسے ہی بگولے رقص کرتے رہتے ہیں؟" رونی نے اپنے والد کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ "معلوم نہیں!" نیلسن نے ایک جگہ تھکن سے چور ہو کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

وہ تینوں بری طرح تھک چکے تھے اس لئے انہوں نے وادی کے ایک کونے میں موجود غار نما جگہ پر اپنا کیمپ لگایا اور رات کا کھانا کھا کر جلد ہی سو گئے۔

صبح جب وہ لوگ سو کر اٹھے تو انہوں نے وادی کو ایک اور ہی روپ میں پایا۔ اب وادی ایک خوبصورت جگہ تھی۔ ہر طرف سبزہ اور طرح طرح کے خوش نما درخت تھے۔ ناشتے کے بعد وہ تینوں خزانے کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ نیلسن آگے آگے چل رہا تھا۔ اچانک اس کی نظر پہاڑی کے ایک پتھر پر پڑی جس پر کچھ کھدا ہوا تھا۔ پتھر پر نظر پڑتے ہی وہ چلّایا۔

"میرے خدا، یہ تو وہ جگہ ہے جہاں کورونا ڈو نے اپنے فوجیوں کے ساتھ قیام کیا تھا۔ یہ دیکھو اس پتھر پر اس کا نام لکھا ہے۔"

کورونا ڈو دراصل کئی صدیوں پہلے کا ایک ریڈ انڈین جنگجو تھا جو اس وادی میں اسی خزانے کی تلاش کے لئے آیا تھا جس کو اب یہ تینوں تلاش کر رہے تھے۔ مگر وہ یہاں وادی میں راستہ بھٹک گیا اور

اپنے تمام ساتھیوں سمیت ہلاک ہو گیا۔ مشہور تھا کہ ان سب لوگوں کے بھوت اس وادی میں رہتے ہیں۔ نیلسن کے دونوں ساتھیوں نے دوڑ کر کورونا ڈو کے دستخط غور سے دیکھے۔ رونی نے اپنا کیمرہ نکال کر ان کی دو تین تصاویر بنائیں اور وہ پھر آگے بڑھ گئے۔ ابھی وہ کوئی دو سو قدم ہی چلے ہوں گے کہ رونی جو آگے آگے چل رہا تھا زور سے چلّایا۔ "یہ رہا..... یہ رہا..... مل گیا..... مل گیا"

ان دونوں نے چونک کر رونی کی طرف دیکھا۔ رونی ایک جگہ پر کھڑا ہوا زور زور سے فضا میں اچھل رہا تھا۔ وہ دوڑ کر اس کے قریب گئے تو انہوں نے دیکھا کہ وہاں پر ایک کان کے آثار موجود ہیں۔ کان کے باہر پگھلی ہوئی دھات اور سڑے ہوئے سر کنڈوں کے ڈھیر پڑے ہوئے تھے۔

"مگر چاندی کی اینٹیں کہاں ہیں؟" چک نے صورت حال کا جائزہ لے کر بے چینی سے پوچھا۔ "واہ واہ کیا عقل پائی ہے آپ نے؟" رونی نے چک کی بات سن کر مسکراتے ہوئے کہا "بھلا کیا وہ اینٹیں آپ کو باہر بکھری ہوئی ملتیں آؤ ہم کان کے اندر انہیں تلاش کریں۔"

کان میں گہرا اندھیرا تھا۔ نیلسن نے لالٹین جلائی اور پھر نہایت احتیاط کے ساتھ قدم رکھتا ہوا اپنے دونوں ساتھیوں کے ساتھ کان میں داخل ہو گیا۔

کان ابتداء میں بہت پتلی اور نیچی تھی مگر وہ جوں جوں آگے بڑھتے گئے اس کی اونچائی اور چوڑائی بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ وہ ایک ایسی جگہ جا پہنچے جہاں ان کی آوازیں کان کے سناٹے میں گونجنے لگیں۔ کان کی زمین اکھڑی ہوئی اور فضا سیلن زدہ تھی۔ انہوں نے کان کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک دیکھ ڈالا مگر انہیں خزانے کے آثار کہیں دکھائی نہ دیئے۔

تب نیلسن نے اپنی جیب سے ایک بار پھر وہی دستاویز نکالی جس میں خزانے کے بارے میں کچھ اشارے موجود تھے۔ دستاویز میں لکھا تھا۔

"چاندی وہاں..... ہے..... جہاں سورج کی روشنی پڑتی ہے....." اس کے بعد دستاویز کے لفظ مٹے ہوئے تھے۔

"اس کا کیا مطلب ہوا..... جہاں سورج کی روشنی پڑتی ہے" نیلسن نے دستاویز کو بند کر کے سوچتے ہوئے کہا۔ "میں سمجھ گیا" چک نے بے ساختہ کہا۔ "کیا سمجھ گئے" رونی نے پوچھا۔

"یہی کہ سورج کی روشنی صرف کان کے دروازہ کے پاس پڑتی ہے اور وہ بھی دن کے کسی مختصر سے وقت میں" چک نے جواب دیا۔

"شکریہ ڈاکٹر واٹسن....." رونی نے مسکرا کر چک کی جانب دیکھا "مگر ہمیں یہ کیسے پتہ چلے گا کہ

سورج کی روشنی کہاں اور کس وقت کان کے کس حصہ میں پڑتی ہے؟"

"مشاہدہ کے ذریعہ" یہ آواز نیلسن کی تھی۔ "میرا خیال ہے کہ اب دوپہر ہونے کو ہے اور سورج ہمارے سر پر سے ہو کر گذرے گا چنانچہ ہمیں پتہ چل جائے گا کہ سورج کی روشنی کان کے کس حصہ میں پڑتی ہے۔"

چنانچہ وہ تینوں واپس کان کے دروازے کی طرف چل پڑے۔ تاہم جب وہ کان کے دروازے پر پہنچے تو شام کے تین بج چکے تھے اور سورج ان کے سروں پر سے ہوتا ہوا غروب ہونے کی طرف چلا گیا تھا۔ "گویا ہم نے اپنی اب تک کی تلاش میں دھات اور سڑے ہوئے سرکنڈوں کے ڈھیر کے سوا کچھ حاصل نہیں کیا۔" چک نے کان سے باہر نکل کر بیزاری کے ساتھ کہا۔

"خیر کچھ ملا ہو یا نہ ملا ہو ہماری مہم اب تک رہی مزیدار ہے۔" نیلسن نے گویا چک کی بات کے جواب میں کہا۔

پھر ان تینوں نے صبح کو پھر خزانے کی تلاش کا ارادہ کر کے وادی کے ایک کونے میں اپنا کیمپ لگایا۔ اور پھر کھانا کھا کر باتیں کرنے لگے۔ مگر رونی عجیب سی بے چینی محسوس کر رہا تھا وہ چاہتا تھا کہ جلد از جلد خزانہ ان کے ہاتھ میں ہو۔ چنانچہ وہ صبح کا انتظار کئے بغیر ہاتھ میں فلیش لائٹ لے کر ایک مرتبہ پھر خزانے کی تلاش میں کان کی طرف چل پڑا۔

کوئی آدھی رات کا وقت ہو گا کہ کیمپ میں موجود نیلسن اور چک نے کیمپ کے باہر کچھ عجیب و غریب آوازیں سنیں۔ پہلے تو انہیں یوں محسوس ہوا جیسے باہر بہت تیز ہوا چل رہی ہو۔ مگر پھر تھوڑی ہی دیر میں باہر کی آوازیں کچھ اور تاثر پیدا کرنے لگیں۔ ایسا تاثر جس نے ان دونوں کے دلوں کو خوف سے بھر دیا۔

"میرے خدا! باہر کیا ہے؟" نیلسن نے خوف زدہ ہو کر پوچھا۔

چک نے جو خوف کے مارے پتھر کی طرح ساکت ہو چکا تھا کوئی جواب نہ دیا۔

چند لمحوں بعد اس وادی میں گھوڑوں کی ٹاپوں کی آوازیں بلند ہونے لگیں اور پھر وادی میں گھوڑوں پر سوار لوگوں کا ایک جلوس داخل ہوا۔ ان لوگوں کے جسم زرہ بکتر سے چھپے ہوئے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں عجیب و غریب رنگوں کے جھنڈے تھے جنہیں وہ فضا میں لہرا رہے تھے اور اپنے منہ سے ناقابل فہم آوازیں نکال رہے تھے۔ ان کے سروں پر لگے ہوئے پر ظاہر کر رہے تھے کہ وہ ریڈ انڈین ہیں۔

چک اور نیلسن کیمپ کے دروازے پر آ گئے۔ "میرے خدا کیا میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں؟"

نیلسن نے کیمپ کے دروازے پر آکر کہا۔ مگر اس کی آواز گھوڑوں کی ٹاپوں کے شور میں گم ہو گئی۔

چک ابھی تک بے حس و حرکت کھڑا تھا۔ اسی لمحہ وادی میں ایک اور عجیب و غریب منظر رونما ہوا۔ اس منظر نے ان دونوں کے دماغوں کو پھرکی کی طرح گھما کر رکھ دیا۔ انہوں نے دیکھا کہ تقریباً سو افراد چمکدار زرہ بکتر پہنے ہاتھوں میں چمکتی تلواریں لئے وادی میں داخل ہوئے اور پہلے والے لوگوں کی سمت میں چلے گئے۔

چند لمحوں بعد ہی لوگوں کا ایک اور جلوس وادی میں داخل ہوا۔ یہ سب گھوڑوں پر سوار تھے۔ اور آپس میں باتیں کر رہے تھے اور گا رہے تھے۔ یہ تیسرا گروہ جیسے ہی نظروں سے اوجھل ہوا رونی سرنگ سے بھاگتا ہوا آیا۔ اس کے ہوش اڑے ہوئے تھے۔

"کیا تم لوگوں نے انہیں دیکھا۔ زرہ بکتر پہنے ہوئے لوگ۔ یہ سب کورو ناڈو کے ساتھی بھوت تھے۔" رونی نے تقریباً چیختے ہوئے کہا۔

یہ تمام مناظر تینوں کے لئے ناقابل یقین تھے۔ وہ تینوں تیزی کے ساتھ اپنے کیمپ کے اندھیرے کونے میں کھسک گئے۔ اور وادی کے دوسری جانب زمین کھودے جانے اور کیمپ لگائے جانے کی آوازیں سننے لگے۔

"تمہارے خیال میں یہ سب کیا ہے؟" رونی نے نیلسن سے پوچھا "میرے خیال میں یا تو ہم تینوں پاگل ہو گئے ہیں یا پھر وقت کئی صدیوں پیچھے چلا گیا ہے" نیلسن کے بجائے چک نے جواب دیا۔

"آئیں اب ہم سو جائیں۔ شاید ہم صبح کو اس بارے میں کچھ جان سکیں" نیلسن نے کہا۔

وہ تینوں رات بھر بے چین نیند سوئے۔ کیونکہ ساری رات وادی میں عجیب و غریب قسم کی آوازیں آتی رہیں۔

صبح سات بجے جب تینوں ناشتہ کر رہے تھے تو انہوں نے دیکھا کہ دو آدمی گھوڑوں پر سوار ان کی جانب چلے آ رہے ہیں۔

"ہیلو" ان میں سے ایک آدمی نے کیمپ کے سامنے گھوڑا روک کر کہا "ہم نے یہاں کسی کو نہیں دیکھا" قبل اس کے کہ وہ اجنبی اور کچھ کہتا نیلسن جسکے چہرے سے خوف کے آثار نمایاں تھا بولا۔

اجنبی جو اپنے چہرے مہرے اور لباس کی تراش خراش سے تاریخ کے کسی صفحہ کے کردار کے بجائے جدید دنیا کا باشندہ لگ رہا تھا نیلسن کی اس حالت پر مسکرا اٹھا۔

"میرے خیال میں آپ لوگوں نے رات کو کوئی ڈراونا خواب دیکھا ہے!" اجنبی نے کہا۔

"ہاں ہمارا بھی یہی خیال ہے!" نیلسن نے جواب دیا۔

"آپ کو ایسا لگنا ہی چاہئے۔ کیونکہ ہماری شوٹنگ ہے ہی ایسی حقیقی" اجنبی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کیا مطلب" نیلسن چونکا

"مطلب یہ کہ ہم یہاں ایک فلم جسکا نام "کورونا ڈو کے بھوت" ہے کی شوٹنگ کر رہے ہیں" اجنبی گویا ہوا

"تو کیا یہ سب ریڈ انڈین، گھڑ سوار، زرہ بکتر والے لوگ سب محض..... محض....." نیلسن آگے کچھ نہ کہہ پایا

"نقلی ہیں۔ بس ان میں سے کچھ ریڈ انڈین اصلی ہیں" اجنبی نے کہا۔ پھر ایک لمحہ رک کر بولا "یہ جگہ ہماری شوٹنگ کے آخری مرحلے میں آتی ہے۔ اس کے بعد ہماری فلم مکمل ہو جائے گی" بہر حال پھر ملیں گے "یہ کہہ کر اجنبی اپنے دوسرے ساتھی کے ساتھ وادی کی دوسری طرف روانہ ہو گیا۔ "ہا..... ہا..... ہا..... ہا" چک نے بے اختیار قہقہہ لگایا اور بولا

"فلم..... اور بھوت۔ خیر یہ اس سلسلہ میں اچھی جگہ ہے، ایک دم فطری"

چند لمحوں بعد رونی ان دونوں کو وہی باتیں کرتا چھوڑ کر ایک بار پھر خزانے کی تلاش میں نکل پڑا۔ تھوڑی دیر بعد اچانک ان دونوں کو رونی کے زور سے چیخنے کی آواز آئی۔ جب وہ دوڑتے ہوئے اس کے قریب پہنچے تو وہ لکڑی کی بیل گاڑی کا ایک پہیہ زمین سے ہٹا رہا تھا۔

پہیہ سرکنڈوں کے ڈھیر پر پڑا ہوا تھا۔ اور اس وقت سرکنڈوں کا وہ ڈھیر ادھر ادھر بکھرا ہوا تھا۔

"دیکھو یہ رہا ہمارا خزانہ" رونی زور سے چلایا "میرے خدا۔ یہ تو کوئی تہہ خانہ ہے۔ نیلسن نے سرکنڈوں کے درمیان جھانک کر دیکھا جہاں اسے تہہ خانے کے اندر چاندی کی چمکتی ہوئی کچھ اینٹیں نظر آ رہی تھیں۔

"تم نے یہ ڈھونڈا کیسے؟" چک نے بے تابی سے رونی سے سوال کیا۔ اور تہہ خانے میں کود گیا۔

"یہ میں نے نہیں، کورونا ڈو کے بھوتوں نے ڈھونڈا ہے۔ ان کے گھوڑے جب یہاں سے گزرے تو سرکنڈوں کا یہ ڈھیر بکھر گیا۔ اور یہ چھپا ہوا تہہ خانہ نظر آنے لگا۔" رونی نے کہا

"کورونا ڈو کے بھوت" نیلسن نے آہستہ سے کہا اور ایک مدھم سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر آ کر گذر گئی۔

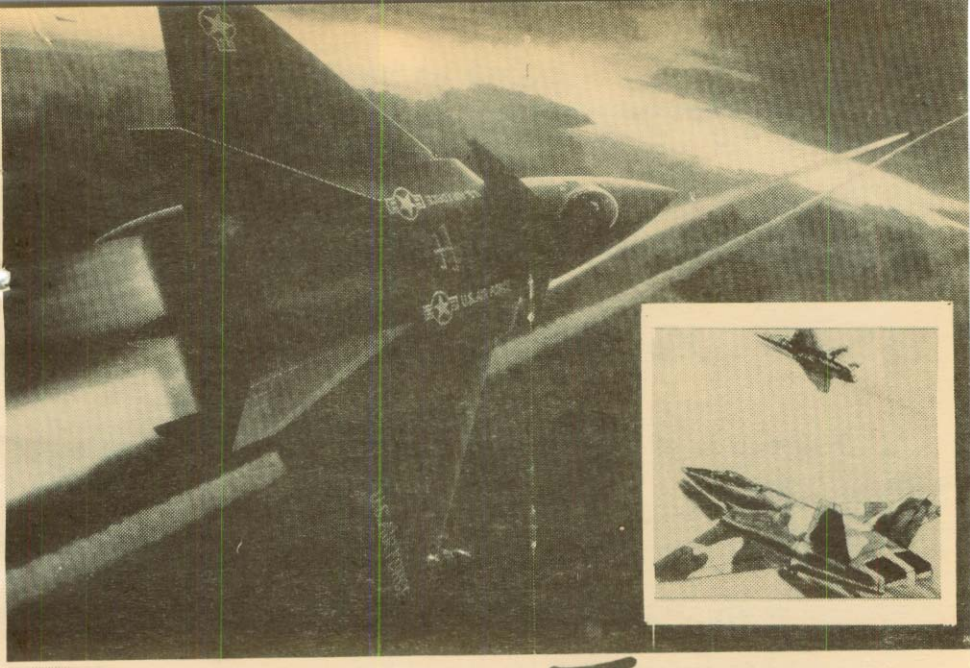

خلیج کی جنگ

اور خوفناک ہتھیار

محمد صالح ارشاد

خلیج میں بھڑک اٹھنے والی جنگ کے ہولناک شعلے اپنی راہ میں آنے والی ہر چیز کو جلا رہے ہیں۔ پیغمبروں کی سرزمین پر لڑی جانے والی یہ ہولناک جنگ کتنے لوگوں کے لہو سے سرد ہوگی اس کا اندازہ تو جنگ ختم ہونے کے بعد ہی ہو سکے گا۔ نسل انسانی کو تباہ کرنے، انسانیت کو تاریکیوں میں دھکیلنے اور اس خوبصورت دنیا کی رنگینوں کو تباہ کرنے کے لئے جو جنگی ساز و سامان استعمال ہو رہا ہے۔ اس کے بارے میں ہم آپ کو مختصراً بتائیں گے۔

جنگی ساز و سامان میں میزائل اور جہاز سرفہرست ہیں۔

B2 STEALTH BOMBER

STEALTH کے معنی چوری چھپے یا خفیہ طور پر کہیں داخل ہونے کے ہیں۔ یعنی یہ طیارہ چوری چھپے دشمن کے علاقے میں بغیر ریڈار پر ظاہر ہوئے داخل ہوتا ہے اور اپنا کام سرانجام دے کر واپس آجاتا ہے۔ اس طیارے کی کہانی ۱۹۵۶ء سے شروع ہوتی ہے۔ جب امریکن سی آئی اے نے روس کی اہم تصاویر کھینچنے کے لئے U2 نامی طیارے کو چوری چھپے بھیجنا شروع کیا تھا۔

U2 اسّی ہزار فٹ کی بلندی پر پرواز کرتے ہوئے روس کی اہم تنصیبات کی تصاویر کھینچ لیا کرتا تھا۔ لیکن پھر ہوا یوں کہ ۱۹۶۰ء میں ایک یو ٹو طیارہ روس میں گرا لیا گیا۔

ان طیاروں کی کامیاب کارکردگی کے بعد امریکہ کو جاسوسی کے لئے مزید بہتر اور جدید طیاروں کی ضرورت محسوس ہوئی اور B2 طیاروں کی تیاری کا کام شروع کر دیا گیا۔ اس کی تیاری کو انتہائی خفیہ رکھا جاتا تھا۔

اس بات کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ ۱۹۸۶ء میں NEVADA کے ریگستان میں ایک جہاز گر کر تباہ ہو گیا تھا۔ جہاز گرنے کے فوراً بعد ریگستان کو فوج نے گھیر لیا اور جہاز کے ایک ایک ٹکڑے کو اٹھا کر لے گئے۔ اس کے علاوہ ٹیلی وژن اور اخباری نمائندوں کو کسی بھی قسم کا کوئی بیان نہیں دیا گیا۔

کئی سالوں کی محنت کے بعد بالآخر یہ طیارہ نارتھ تھروپ کمپنی کے پلانٹ میں ۱۹۸۸ء کو صحافیوں اور خاص مہمانوں کے سامنے پیش کیا گیا۔

اس طیارے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ طیارہ دشمن کے ریڈار پر نظر نہیں آتا۔ اس بات کو سمجھنے کے لئے یہ بہتر ہو گا کہ آپ ریڈار کو سمجھ لیں۔

ریڈار طیاروں کی فضا میں نشاندہی کے لئے ایک خاص قسم کی لہریں فضا میں منتشر کرتا ہے۔ اگر فضا میں کوئی جہاز موجود ہوتا ہے تو یہ لہریں جہاز کی سطح سے ٹکرا کر واپس ہوتی ہیں۔ جنہیں ریڈار دوبارہ وصول کر لیتا ہے اور اس طرح سے دشمن کے جہاز کی رفتار اور مقام کا پتہ چل جاتا ہے۔

STEALTH کی سطح پر ایک قسم کا رنگ کیا گیا ہے جو ریڈار کی لہروں کو جذب کر لیتا ہے۔ اس طرح یہ طیارہ ریڈار کو دھوکہ دے دیتا ہے۔ یہ طیارہ عموماً رات کو اڑایا جاتا ہے۔ اس کا کام یہ ہے کہ یہ دشمن کے علاقے میں گھس کر اس کے ہوائی اڈوں، میزائل کے اڈوں اور دیگر اہم فوجی تنصیبات کا سراغ لگا کر انہیں اپنے ساتھی طیاروں کو منتقل کر دیتا ہے۔ جو میزائیلوں اور بموں سے لیس ہوتے ہیں۔ اس طرح ساتھی طیارے بالکل ٹھیک ہدف پر بم گرا کر دشمن کا بیڑہ غرق کر دیتے ہیں۔

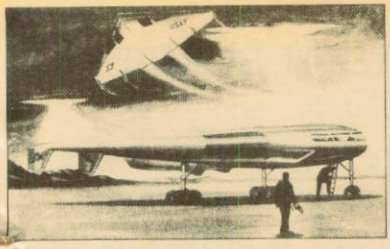

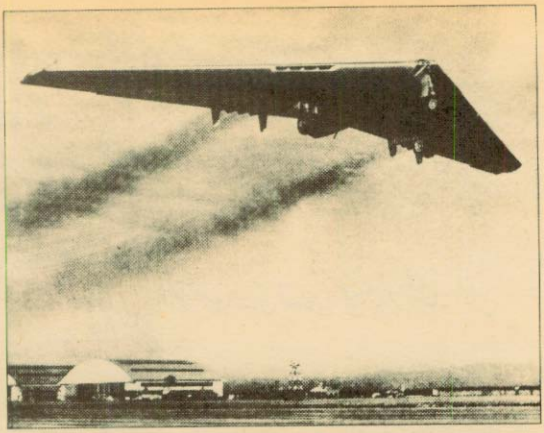

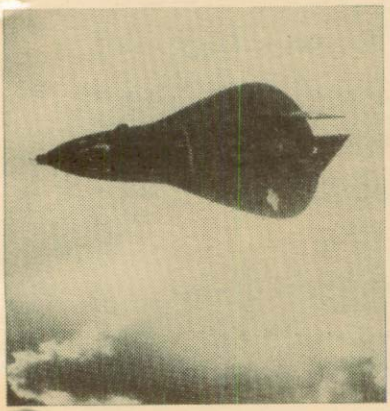

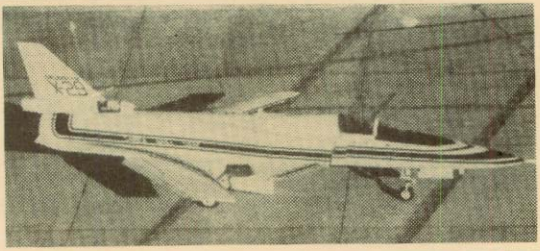

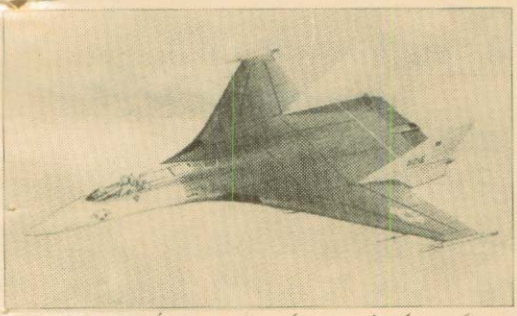

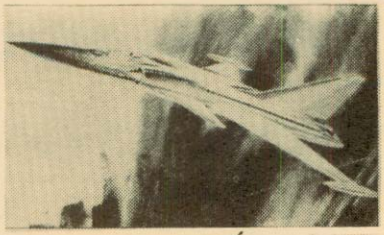

میزائیل

میزائیل ایسے راکٹ کو کہتے ہیں جو اپنے ہدف تک دھماکہ خیز مادہ لے کر جاتا ہے۔ میزائیل ۲۰ کلو میٹر سے لے کر ۶۰۰۰ کلو میٹر تک مار کر سکتا ہے۔ میزائیل میں نصب کمپیوٹر میں اس کے نشانے سے متعلق معلومات اور تصاویر کو فیڈ (Feed) کر کے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ میزائیل جب اپنے نشانے کے قریب پہنچتا ہے تو وہ اپنے ہدف کی تصاویر لے کر اسے اپنے کمپیوٹر میں موجود تصاویر اور معلومات سے ملا کر دیکھتا ہے اور جواب ہاں میں آنے کی صورت میں یہ اپنے ہدف سے ٹکرا جاتا ہے۔ اس مضمون میں شامل تصویر

میں جس کروز میزائیل کی کارکردگی دکھائی گئی ہے۔ وہ میزائیل اپنے ہدف سے ۶۴۰ کلو میٹر دور ایک آبدوز سے چھوڑا گیا تھا۔ اس میزائیل کے کمپیوٹر میں موجود معلومات نے اسے ۶۴۰ کلو میٹر دور نشانے تک پہنچنے میں مدد دی اور اس طرح اس نے ایک مضبوط ہدف کو تباہ کر دیا۔

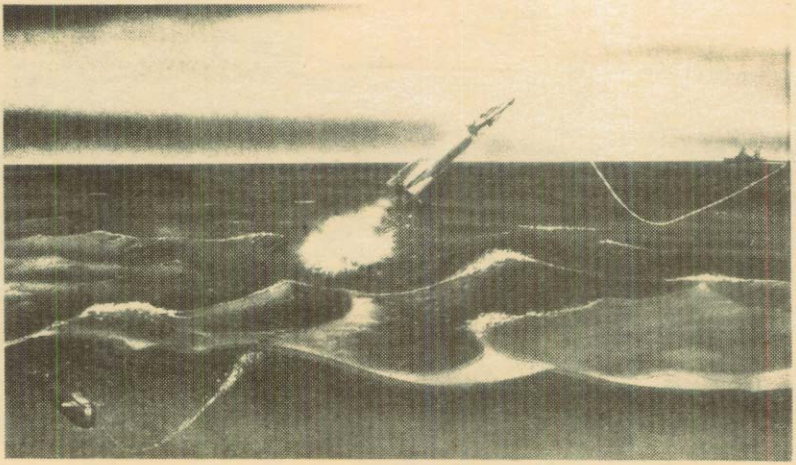

EXOCET میزائیل

عراق اور امریکہ کی جنگ میں ایک نام آپ کئی بار سن چکے ہوں گے اور وہ ہے EXOCET میزائیل۔ یہ میزائیل فرانس کی کمپنی AEROSPATIALE نے تیار کیا ہے۔ یہ میزائیل آبدوز، ہیلی کاپٹر، ہوائی جہاز اور پانی کے جہاز سے بخوبی چھوڑا جاسکتا ہے۔ یہ میزائیل پانی کے جہاز کو ڈبونے کے کام آتا ہے اور یہ سطح سمندر سے آٹھ فٹ کی بلندی پر پرواز کرتے ہوئے اپنے ہدف کی جانب بڑھتا ہے۔ اس میزائیل کے کمپیوٹر میں موجود معلومات دشمن کے جہاز اور اس کی رفتار کی نشاندہی کرتی ہیں۔ ایک بار یہ چھوڑ دیا جائے تو پھر یہ جہاز کو غرق کر کے ہی دم لیتا ہے۔

یہ صرف جھلک ہے ان ہتھیاروں کی جو اس جنگ میں انسان کے ہاتھوں انسان کو مارنے کے کام آرہے ہیں۔

کروڑوں روپے کے ہتھیار صرف اور صرف تباہی کے لئے استعمال ہو رہے ہیں۔ کیا یہ خوبصورت دنیا تباہ ہونے کے لئے بنائی گئی تھی؟ کیا اس دنیا کے انسان لڑ لڑ کر مر جائیں گے؟ یہ ہے وہ سوال جس کا جواب کسی کے پاس نہیں۔

ذرا تصور کیجئے

اگر یہ سچا واقعہ آپ کے ساتھ گزرا ہوتا تو

آپ کیا کرتے۔

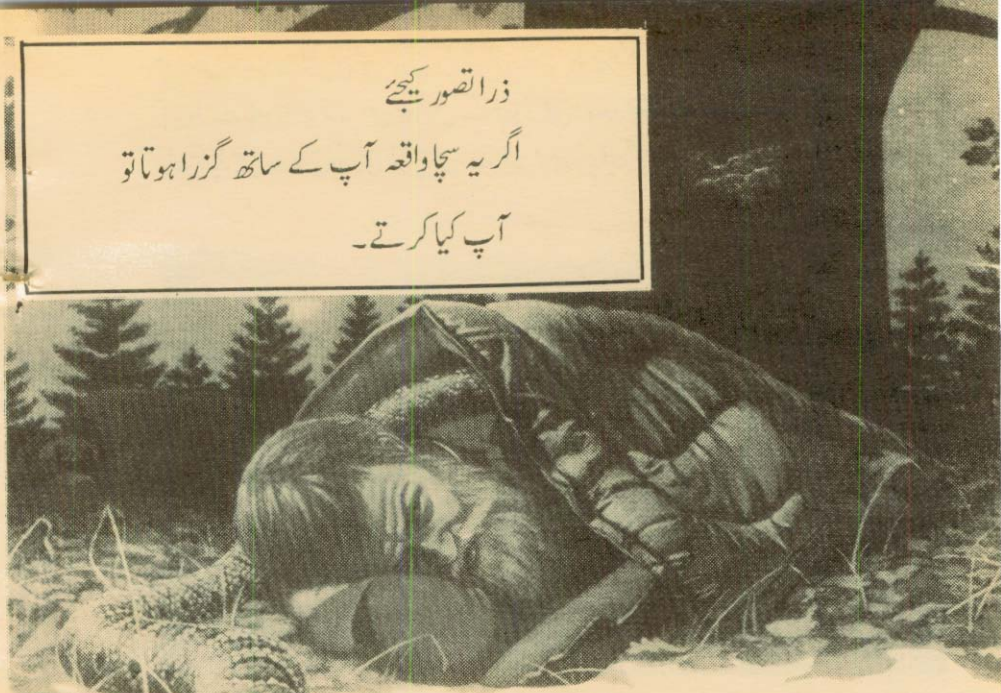

ایک رات

جارج یو. لی. داٹز

ترجمہ:۔ منیر احمد راشد

اکتوبر کا مہینہ اور شام کا وقت تھا۔ میں اور میرا دوست جوائے ڈک جنوب مغربی میسیسیپی کے پہاڑی علاقے میں سفید دم والے ہرنوں کے شکار کی غرض سے آئے ہوئے تھے۔ یہاں ہم نے ایک

عارضی کیمپ قائم کیا تھا۔ اس وقت میں اور جوائے، ہیوٹ پہاڑ کی چوٹی پر موجود تھے۔ ہلکی ہلکی خوشگوار خنک ہوا چل رہی تھی۔ موسم سرما کی ابتدائی ٹھنڈ نے ہرے بھرے درختوں کو سنہری روپ دے دیا تھا اور یہ سنہرے پتے نیچے بھی جا بجا بکھرے نظر آرہے تھے۔ ہم سینکڑوں فٹ نیچے موجود دلدل کو دیکھ رہے تھے جس کے اوپر دھند نے اپنی چادر پھیلا رکھی تھی۔ اس سے بالکل ملی ہوئی پہاڑی ندی کسی شریر بچے کی طرح اٹھلاتی، بل کھاتی پتھروں کے چٹکیاں لیتی، گنگناتی ہوئی نشیب کی طرح پھسل رہی تھی اور اس ندی کے اُس پار پہاڑی کے دامن سے لے کر دریائے ہوموچیتو کے کنارے تک پھیلے ہوئے سویابین کے کھیت مستی میں لہرا رہے تھے۔ عجیب پُر کیف منظر تھا۔ میں اور جوائے اس دلفریب اور حیران کن نظارے کے سحر میں ڈوبے کافی دیر وہاں بیٹھے رہے پھر جب ڈوبتے ہوئے سورج نے اپنے ساتھ ہی شفق کا دامن بھی کھینچ لیا تو ہم دونوں اپنے کیمپ کی طرف آگئے۔

رات کا کھانا کھانے کے بعد ہم جلد ہی بستروں میں گھس گئے کیونکہ ٹھنڈ آہستہ آہستہ بڑھتی جا رہی تھی۔ ہمارے سلیپنگ بیگ شاہ بلوط کے ایک درخت کے نیچے بچھے ہوئے تھے۔ تمام پہاڑی علاقہ اندھیرے میں ڈوب گیا تھا۔ درختوں کے بھی بس ہیولے سے نظر آرہے تھے۔ آخری تاریخوں کا ادھورا چاند دور ایک پہاڑی کی اوٹ سے نکلا اور بڑے سے شاہ بلوط کی شاخ پر بیٹھ کر حیرت سے ہمیں تکنے لگا۔ جیسے سوچ رہا ہو کہ یہ کون ہیں جو اس کی تنہائی میں مخل ہونے آگئے ہیں۔ سناٹا بھی اونگھتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ جب ہوا کی گدگدی سے درختوں کے پتے ہنستے اور تالیاں بجانے لگتے اور بلوط کے دانے لوٹ پوٹ ہو کر ٹپ ٹپ ہمارے چاروں طرف گرنے لگتے تو فضا میں ایک مدھ سی دھن بکھر جاتی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ میرا ساتھی جلد ہی نیند کی وادی میں کھو گیا۔ تاہم میں جاگتا رہا اور کوشش کرتا رہا کہ ڈِک کے خراٹوں اور کہیں قریب ہی سے اچانک چیخ پڑنے والے اُلو کی آواز کو نظر انداز کر کے سو جاؤں مگر ایسا نہ ہو سکا۔ میں نے کروٹ بدلی اور سیدھے ہاتھ کا سرہانہ بنا کر لیٹ گیا۔ تب میں نے سفید دم والے ہرنوں کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا جن کے شکار کی غرض سے ہم یہاں آئے تھے۔ سوچ کا پنچھی آہستہ آہستہ پرواز کرتا ہوا مجھے اس حسین وادی میں لے گیا جہاں سفید دم والے ہرنوں کی ڈاریں اچھاتی کودتی میری نظروں کے سامنے سے گزر رہی تھیں۔ میرا دل بلیوں اچھل رہا تھا اور میں اونچی اونچی جھاڑیوں میں سے ہوتا ہوا دبے قدموں ان کی طرف بڑھ رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ آج میں دس بیس ہرن ضرور مار لوں گا۔ لیکن جیسے ہی میں نے ایک بڑی سی جھاڑی کی اوٹ سے نکل کر آگے جانا چاہا تھا مجھے محسوس ہوا کہ خار دار جھاڑی میرے پاؤں سے لپٹ گئی ہے اور میں حرکت نہیں کر سکتا۔ خوف کے

احساس سے فوراً میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے دیکھا کہ میں شاہ بلوط کے نیچے اپنے سلیپنگ بیگ کے اندر لیٹا ہوا ہوں۔ میرا دایاں بازو اب بھی میرے سر کے نیچے رکھا ہوا ہے۔ اردگرد کا ماحول بھی وہی ہے بس چاند شاہ بلوط کی شاخ سے اڑ کر آسمان پر جا اٹکا ہے..... مگر یہ میرا دل کیوں زور زور سے دھڑک رہا ہے..... ؟ کیا میں نے کوئی خوف ناک خواب دیکھا ہے..... ؟ ہاں شاید خواب ہی تو تھا..... لیکن نہیں اب میں محسوس کر رہا تھا کہ کوئی کھردرا وجود، بالکل خاردار جھاڑی کی طرح کا، میرے ٹخنے پر رینگ رہا ہے..... کسی انجانے احساس کے تحت میرے اعصاب تن گئے..... ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ سی ہونے لگی اور دل اور زور زور سے دھڑکنے لگا..... میرے دماغ میں ایک جھماکا سا ہوا "سانپ"..... اور سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں فرینکلن کنٹری سے متعلق پرانی داستانیں میرے ذہن کے پردے پر کسی فلم کی طرح تیزی سے گزرنے لگیں۔ میں نے سنا تھا کہ وہاں بہت ہی خطرناک سانپ اور دوسرے زہریلے کیڑے پائے جاتے ہیں۔ بعض اوقات جن کے ڈس لینے سے بہت سے آدمی موت کے منہ میں جا چکے تھے۔

میں بالکل بے حس و حرکت لیٹا اپنے حواس کو قابو میں رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اتنے ٹھنڈے موسم کے باوجود پورے بدن کے مسام پسینہ اُگلنے لگے تھے۔ سانپ آہستہ آہستہ اوپر کی طرف رینگ رہا تھا۔ میں نے دَم سادھ لیا کیونکہ میں جانتا تھا کہ اگر میں نے ذرا بھی حرکت کی یا اپنے خوف کا تھوڑا سا بھی تاثر دیا تو وہ زہریلا سانپ ضرور مجھے ڈس لے گا۔ یہی وجہ تھی کہ اپنی شدید خواہش کے باوجود میں سانس بھی نہ لے سکا۔

سانپ اب میری رانوں کے پچھلے حصے سے رگڑ کھاتا ہوا ایک ایک انچ آگے سرک رہا تھا۔ میرے معدے میں بُری طرح اینٹھن ہو رہی تھی۔ بلوط کے دانے میرے سر کے چاروں طرف گر رہے تھے۔ ان کی ٹپ ٹپ اب دھماکوں کی طرح محسوس ہونے لگی تھی۔ کبھی کبھار کوئی دانہ میرے سر پر گرتا تو یوں لگتا جیسے کسی نے پتھر دے مارا ہو۔ ایسے میں ایک غیر محسوس سی لرزش پورے بدن میں دوڑ جاتی..... میری آنکھیں بند تھیں اور نگاہوں کے سامنے اہل خانہ کی تصویریں گھوم رہی تھیں میری ماں..... میری بیوی..... میری کم سن معصوم بیٹی جو سفید دُم والے ہرن کی کھال کے انتظار میں ہر روز میری راہ تکتی ہوگی..... میں نے بڑی دل سوزی اور کرب کے ساتھ اپنے رب سے اپنے گناہوں کی معافی مانگی اور دعا کی کہ وہ مجھے اس مصیبت سے نجات دلائے۔

اچانک میں نے محسوس کیا کہ وہ رینگتی اور گدگدی سے پیدا کرتی ہوئی حرکت رک گئی ہے۔ سانپ

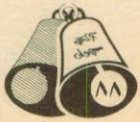

اب میری اوپر والی ٹانگ اور کولہے کے ساتھ ساتھ لمبائی کے رخ لیٹا ہوا تھا۔ میرا پورا جسم سن ہو چکا تھا۔ اس تکلیف دہ صورت حال سے بچ نکلنے کا کوئی طریقہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ حرکت دوبارہ ہوئی اور سانپ میرے کولہے پر سے آہستہ آہستہ رینگتا ہوا سامنے کی طرف میرے پیٹ اور رانوں کے درمیان گرم جگہ پر کنڈلی مارنے لگا۔ اس وقت میں نے سوچا کہ ایک دم اچھل کر سلیپنگ بیگ سے باہر نکل جاؤں مگر کوشش کے باوجود میں ہل بھی نہ سکا۔

میں اور سانپ دونوں بالکل بے حس و حرکت پڑے تھے۔ ڈک کے خراٹے بند ہو چکے تھے الّو بھی شاید تھک کر سو گیا تھا۔ پتوں سے ہوا کی سرگوشیاں اور بلوط کے دانوں کی ٹپ ٹپ بھی متروک ہو چکی تھی آنکھ کی جھری سے میں نے جھانکا تو چاند بھی دم سادھے ایک درخت کی اوٹ سے جھانک رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے ساری کائنات کی حرکت رک گئی ہے۔ میرا چہرہ مارے خوف کے سفید پڑ گیا تھا۔ بہت دیر تک سانس روکے رکھنے کی وجہ سے دم سا گھٹتا ہوا لگ رہا تھا۔ جی چاہا کہ ایک لمبا اور گہرا سانس لوں مگر میں ایسا نہ کر پایا۔ پھر جب سانپ دوبارہ حرکت میں آیا تو یوں لگا جیسے میرا دوران خون ایک دم بڑھ گیا ہو۔ بہت زیادہ ..... ناقابل برداشت ..... بے ساختہ دل سے دعا نکلی۔

"یا اللہ مجھے بچا لے۔"

میں بالکل منجمد پڑا تھا۔ میرا دل میری کنپٹیوں میں دھڑک رہا تھا۔ سانپ میرے سینے کے ساتھ ساتھ اوپر کی طرف بڑھ رہا تھا۔ پورے بدن میں چیونٹیاں سی رینگتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ پھر چاند کی مدھم روشنی میں ادھ کھلی آنکھ سے میں نے دیکھا کہ انسانی دل کی شکل کا مہلک زہر سے بھرپور سانپ کا سر میرے چہرے کی طرف بڑھ رہا ہے۔ وہ زمین سے ذرا سا اوپر اٹھا ہوا تھا۔ ننھی ننھی آنکھوں میں بلا کی چمک تھی اور پتلی پتلی دو زبانیں بے چینی سے منہ کے اندر باہر آ جا رہی تھیں۔ وہ تھوڑا دائیں تھوڑا بائیں لہراتا رک رک کر آگے بڑھ رہا تھا۔ پھر جب وہ مٹھی برابر سر میری بالوں بھری ٹھوڑی سے ٹکرایا تو میری ادھ کھلی آنکھ خود بخود بند ہو گئی۔ حواس خمسہ صرف ایک ہی حس میں سمٹ آئے تھے یعنی چھونے کی حس ..... میں نے محسوس کیا کہ سانپ کے جسم کے بل کہیں میرے جسم کو چھوتے اور کہیں سے ہٹتے ہوئے آگے اور آگے بڑھتے آ رہے ہیں۔ اس کا سر میری داڑھی سے ہوتا ہوا میرے رخسار پر، پھر کان کے قریب سے ہو کر سر پر اور پھر بیگ سے باہر نکل گیا۔ بل کھاتا اور رک رک کر سرکتا ہوا سارا جسم اسی ٹریک سے بیگ سے باہر جا رہا تھا۔ بالآخر سانپ کی کھڑکھڑاتی دُم میرے کان پر برش کرتی اور ایک کرخت سی آواز پیدا کرتی ہوئی سر کے بالوں سے الجھ کر بیگ سے باہر چلی گئی۔ کچھ دیر تک خشک پتوں پر اس کے سرسرانے کی آوازیں آتی

رہیں اور پھر ایک مہیب سناٹا چھا گیا۔ میں اب بھی کسی لاش کی مانند بے حس و حرکت پڑا تھا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ سانپ کتنی دور چلا گیا ہے۔ اس کے باوجود مجھے یوں لگتا تھا جیسے وہ میرے بالکل قریب موجود ہے اتنا قریب کہ ادھر میں نے حرکت کی اور ادھر اس نے ڈسا۔ میں یونہی آنکھیں موندے لیٹا رہا۔ نجانے کتنا وقت گذر گیا۔ پھر چڑیوں کی چہکار کے ساتھ ہی میں نے جوائے کی خوشگوار آواز سنی۔ وہ سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ہی بیدار ہو گیا تھا اور اب مجھے جگانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی آواز سن کر میں نے آنکھیں کھولیں اور اپنی جگہ سے ہلے بغیر سرگوشی کی،

"ہش..... سانپ..... سانپ!

"سانپ!..... کیا مطلب ہے تمہارا؟" اس نے حیرت سے کہا۔ "یہاں تو کوئی سانپ وانپ نہیں ہے۔"

میں نے مضطربانہ انداز میں دیکھا واقعی وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ تب میں بستر سے نکلا اور رات بھر ٹپکنے والے بلوط کے دانوں سے آلودہ سلیپنگ بیگ کو جھاڑ کر تہہ کیا۔

جوائے نے ناشتا وغیرہ بنانے اور ہاتھ تاپنے کے لئے آگ جلالی تھی۔ اور اس کے قریب بیٹھا سردی سے سکڑ رہا تھا۔ میں بھی وہاں پہنچ گیا اور ہاتھ تاپنے لگا۔ اسی دوران میں اسے رات کے واقعے کی تفصیلات بھی بتا رہا تھا۔ میری بات سن کر جوائے نے ایک زبردست قہقہہ لگایا۔ جیسے میں نے اسے کوئی لطیفہ سنایا ہو۔ وہ ہنسی سے لوٹ پوٹ ہوا جا رہا تھا۔ میں ہونقوں کی طرح اسے تکنے لگا وہ میرے چہرے کی طرف دیکھتا اور اس کی ہنسی میں اضافہ ہو جاتا..... کافی دیر بعد اس نے اپنی ہنسی پر قابو پایا اور مجھے ایک معصوم بچے کی طرح پچکارتے ہوئے سمجھانے لگا کہ میں نے کوئی بھوت پریت دیکھ لیا ہو گا۔ میں سمجھ گیا کہ اسے میری بات کا یقین نہیں آیا ہے اور وہ میرا مذاق اڑا رہا ہے۔ میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ میں رات بھر جو موت سے جنگ کرتا رہا ہوں اس کے بارے میں مزید کچھ کہنا بھی بے کار ہو گا۔ لہٰذا میں خاموش رہا اور دل ہی دل میں اپنے رب کا شکر ادا کیا جس نے مجھے موت کے منہ میں جانے سے بچایا تھا۔ اس دن شکار میں بھی بالکل دل نہیں لگا کیونکہ میرا ذہن رات کے واقعے کی وجہ سے ابھی تک پریشان تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ بعض اوقات انسان کی زندگی میں ایسے واقعات بھی پیش آجاتے ہیں جن پر کوئی یقین کرنے کو تیار نہیں ہوتا۔ اور جن کا کسی طریقہ سے یقین دلایا بھی نہیں جا سکتا..... مگر مجھے اس بات میں ذرا بھی شبہ نہیں تھا کہ رات میرے ساتھ بیگ میں ایک سانپ بھی تھا۔ کیونکہ اس کی حرکت سے پیدا ہونے والی گدگدی میں اب بھی اپنے بدن میں محسوس کر رہا تھا۔

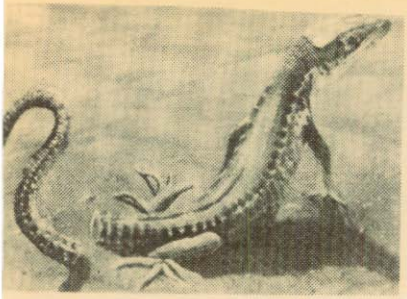

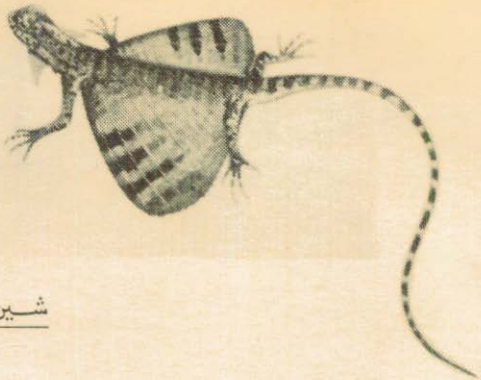

شین فاروقی

فطرت کی دُنیا

رینگنے والے کیڑے

مچھلیوں کی طرح رینگنے والے حیوانات کے بھی ریڑھ کی ہڈی ہوتی ہے۔ تاہم مچھلیوں کے برعکس وہ خشکی پر زیادہ بہتر محسوس کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان حیوانات کی کھال ذرا موٹی اور سخت ہوتی ہے، جو پانی کو ان کے جسموں پر سے ہٹنے میں رکاوٹ بنتی ہے۔ چنانچہ نرم کھال والے حیوانات کے برعکس یہ خشک مقامات پر رہنا پسند کرتے ہیں۔ ان میں سے اکثر کے پاؤں نہایت مضبوط ہوتے ہیں جو انہیں رینگنے میں بڑی مدد دیتے ہیں۔ ان میں سے تقریباً سب ہی ہوا میں سانس لیتے ہیں۔

البتہ کچھ رینگنے والے حیوانات پانی میں رہنا پسند کرتے ہیں۔ یہ اور بات کہ وہ انڈے دینے کے لئے خشکی کا رخ کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں مگرمچھوں کو مثال کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔ رینگنے والے حیوانات کے انڈوں کا چھلکا خاصا موٹا ہوتا ہے جس کے باعث ان کے انڈے خشکی پر سوکھتے نہیں۔ رینگنے والے حیوانات میں سے بہت سے سانپ ایسے ہوتے ہیں جو انڈوں کے بجائے بچے دیتے ہیں۔

رینگنے والے حیوانات کی تین قسمیں ہوتی ہیں۔

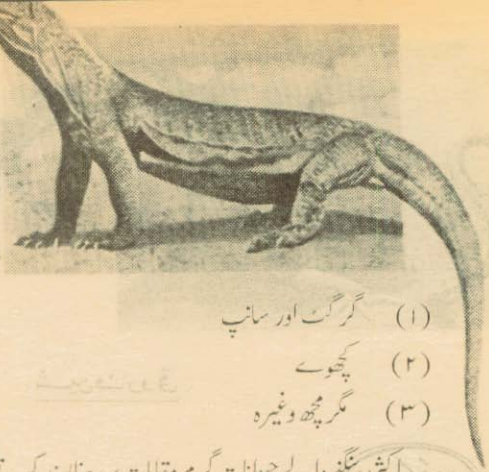

یہ چھپکلی نما جانور انڈونیشیا میں پایا جاتا ہے۔
اس کی لمبائی تین میٹر تک ہوتی ہے۔

(۱) گرگٹ اور سانپ
(۲) کچھوے
(۳) مگرمچھ وغیرہ

اکثر رینگنے والے حیوانات گرم مقامات پر رہنا پسند کرتے ہیں۔ یہ حیوانات دوسرے حیوانات کو غذا کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ البتہ ان میں سے کچھ گھاس بھی کھاتے ہیں۔

سانپ، شکاری پرندے جیسے الّو اور لومڑی وغیرہ حیوانات ہی کو غذا کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ دشمنوں سے خود کو محفوظ رکھنے کے لئے گرگٹ اپنا رنگ تبدیل کر سکتے ہیں۔ اسی طرح کچھوے اپنی حفاظت کی خاطر خود کو اپنے سخت جسم کے اندر چھپا لیتے ہیں۔ گرگٹ اور کچھوے کے برعکس کچھ حیوانات اپنے دشمنوں سے چھپنے کے بجائے ان کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ اکثر بڑے سائز کے رینگنے والے حیوانات بڑے خطرناک ہوتے ہیں۔ مگرمچھ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ سات میٹر تک لمبا ہو سکتا ہے۔ اسی طرح سانپ کا ایک ایسی نسل بھی موجود ہے جو دس میٹر تک لمبی ہو سکتی ہے۔

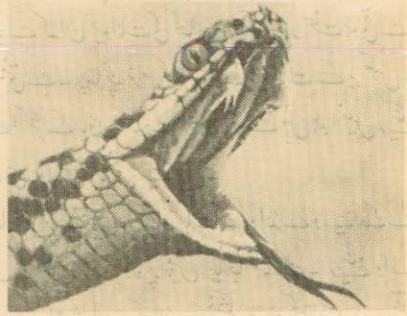

سانپ بڑا سا منہ کھول کر اپنی موٹائی سے زیادہ موٹے شکار کو کھا سکتا ہے۔

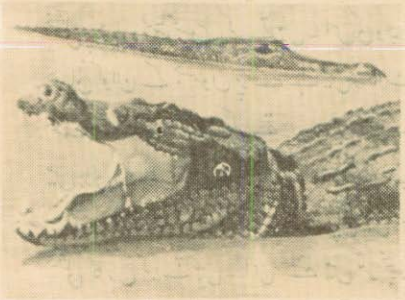

منتظر ہوں شکار کا اپنے۔

اکثر رینگنے والے حیوانات سانپوں سے مختلف ہوتے ہیں۔ مثلاً ان میں سے اکثر کے پاؤں ہوتے ہیں مگر سانپ کے پاؤں نہیں ہوتے۔ البتہ کچھ رینگنے والے حیوانات ایسے بھی ہیں جن کے پاؤں نہیں ہوتے مثلاً کیچوے۔ اکثر سانپ زہریلے ہوتے ہیں۔ یہ سانپ ڈنک مار کر اپنے شکار کو ہلاک کر دیتے ہیں۔ سانپوں کے برعکس کچھ رینگنے والے حیوانات اپنے شکار کو ہلاک کرنے کے لئے اس کے گرد لپٹ جاتے ہیں۔ اور اپنے جسم کی گرفت کو اس کے گرد اتنا سخت کر دیتے ہیں کہ ان کا شکار ہلاک ہو جاتا ہے۔ سانپ زمین کے اوپر لہرا کر چلتے ہیں۔ اسی طرح وہ اپنے جسم کی کھال کو آگے پیچھے حرکت دے کر بھی چلتے ہیں۔

کچھوے عام طور پر پانی کے اندر رہتے ہیں۔ ان کے جسم پر موجود چھلکا اتنا سخت ہوتا ہے کہ آسانی کے ساتھ نہیں ٹوٹ سکتا۔ کچھوے خطرے کی صورت میں اپنے آپ کو اسی خول میں چھپا لیتے ہیں۔ کچھوؤں کا یہی خول انہیں زمین پر چلنے پھرنے میں تکلیف دیتا ہے۔

مگرمچھ ایک خطرناک حیوان ہے۔ یہ ندیوں، تالابوں اور ساحلی علاقوں میں پایا جاتا ہے۔ خشکی پر پڑے ہوئے یہ اکثر اپنے شکار کا انتظار کرتے رہتے ہیں۔ یہ اپنی جسامت سے کہیں بڑے حیوانات کو ساحل سے گھسیٹ کر پانی میں لے جاتے ہیں اور پھر انہیں ٹکڑے ٹکڑے کر کے کھاتے ہیں۔

اب ہر ہفتے ۱۴ پروازیں

کراچی
فیصل آباد
کراچی

پاکستان انٹرنیشنل نے کراچی اور فیصل آباد کے درمیان جمعرات کو ایک براہ راست اضافی پرواز متعارف کی ہے۔ اس پرواز کے اضافے سے اب پی آئی اے مندرجہ بالا رُوٹ پر صبح کی سات اور شام کی سات پروازوں کی سہولت پیش کرتی ہے۔

روزانہ	بدھ	منگل	*روزانہ علاوہ منگل - بدھ		دن		*روزانہ علاوہ منگل - بدھ	منگل	بدھ	روزانہ
342	340	366	336		پرواز نمبر-پی کے		337	367	341	343
737	737	737	737		طیارہ		737	.737	737	737
FY	FY	FY	FY		درجہ		FY	FY	FY	FY
1030	1630	1730	2000	روانگی	کراچی	آمد	2359	2330	2310	1430
	1730 1810			آمد روانگی	سکھر	روانگی آمد			2210 2130	
		1855 1930		آمد روانگی	ملتان	روانگی آمد		2205 2130		
1210	1925	2010	2140	آمد	فیصل آباد	روانگی	2220	2050	2015	1250

*یہ نئی پروازوں کو ظاہر کرتا ہے۔

مزید تفصیلات کے لئے اپنے ٹریول ایجنٹ یا پی آئی اے کے بکنگ آفس سے رابطہ کریں۔

پی آئی اے PIA
پاکستان انٹرنیشنل
باکمال لوگ۔ لاجواب پرواز

PID(ISLAMABAD)

IAL-PIA-1-91

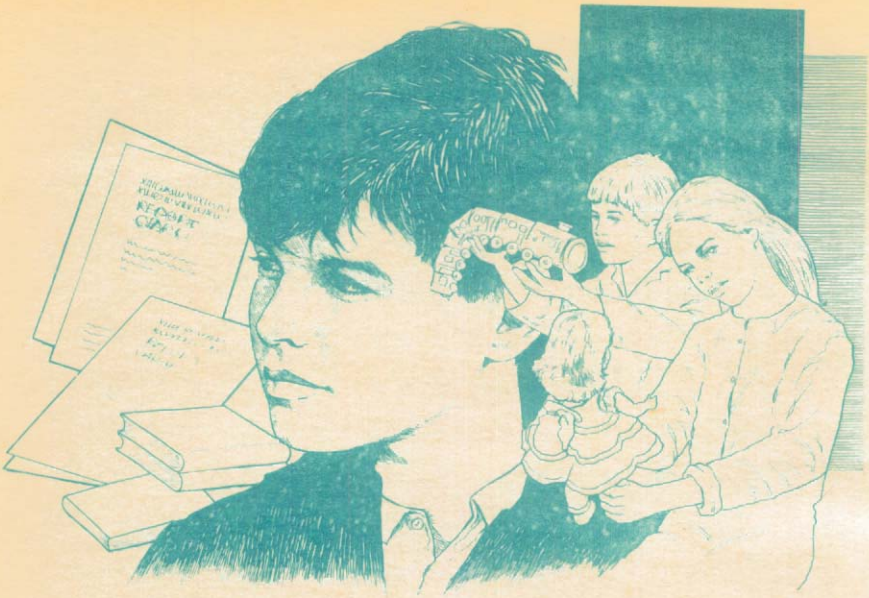

آخری پیریڈ

ریاض احمد خان

ٹن ٹن..... ٹن ٹن..... اسکول کا گھنٹہ بجتے ہی ہر طرف شور سا بلند ہوا۔ دراصل آج صبح ہی سے بچوں کو اس کے بجنے کا انتظار تھا۔ آج سالانہ امتحان کا رزلٹ نکلنا تھا۔ چنانچہ چوتھے پیریڈ کے بعد جیسے ہی چھٹی کا یہ گھنٹہ بجا تمام بچے بھاگتے ہوئے میدان میں جمع ہونے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے سب کے سب اپنی اپنی کلاسوں کے لحاظ سے الگ الگ لائینوں میں کھڑے ہوگئے۔ رزلٹ سنائے جانے کا وقت بہت قریب تھا۔ ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا اور چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے تمام ماسٹر صاحبان اور مسیں مع ہیڈ مس کے ان کے سامنے بنے ہوئے بڑے سے چبوترے پر کھڑی ہوگئیں۔ ان کے ہاتھوں میں بہت سارے کاغذات تھے۔ بچوں میں کچھ دیر کے لئے ہلچل مچی پھر خاموشی چھا گئی۔ پہلی جماعت کے رزلٹ کا اعلان

شروع ہوا۔ تمام بچوں کی توجہ پہلی جماعت کی مس کی طرف تھی۔ جلد ہی رزلٹ کا اعلان دوسری اور پھر تیسری جماعت سے ہوتا ہوا چوتھی جماعت تک پہنچ گیا۔ یہ اس اسکول کی سب سے سینئر جماعت تھی اور انہیں اگلے سال پانچویں میں جانا تھا۔ دراصل پانچویں تک کا ہی یہ ایک چھوٹا سا بہت ہی خوب صورت اسکول تھا۔ اسے قائم ہوئے چار سال ہو چکے تھے۔ ان چار برسوں میں کھیل کے میدان کے چاروں طرف پھولوں کی جو خوب صورت کیاریاں لگائی گئی تھیں اب بہار پر تھیں اور رنگ برنگے پھولوں سے لدی ہوئی تھیں۔ جن کی خوش بو ہوا کے جھونکوں کے ساتھ پورے میدان میں پھیل رہی تھی۔ تمام اسکول کی توجہ اب چوتھی جماعت کی طرف تھی۔ ہر طرف دوبارہ مکھیوں کی سی بھنبھناہٹ شروع ہو چکی تھی۔ بچوں کی دلچسپی اب غالباً اس لئے بڑھ گئی تھی کہ یہ ان کے سب سے سینئر دوستوں کی کلاس تھی اور اب وہ صرف ایک سال کے مہمان رہ گئے تھے۔ اس کے بعد انہیں دوسرے اسکولوں میں چلے جانا تھا۔ ممکن ہے یہ بھی وجہ ہو کہ اس میں حنا اور کامران پڑھتے تھے جو سارے اسکول میں ہر ایک کی توجہ کا مرکز تھے۔ ان دونوں کے مکان اسکول کے قریب ہی تھے۔ چنانچہ جب اسکول میں پڑھائی کی ابتدا ہوئی تو سب سے پہلے انہوں نے ہی داخلے لئے تھے۔ اس دن جو ان دونوں میں پڑھائی کا مقابلہ شروع ہوا تو اب تک چل رہا تھا۔ ہر سال حنا اپنی کلاس میں اول آتی اور کامران دوم۔ اس میں شک نہیں کہ کامران شرارتوں میں بھی کسی سے کم نہیں تھا لیکن اس میں ایک عادت مسلسل چلی آ رہی تھی کہ امتحان قریب آتے ہی ڈٹ کر محنت کرتا اور یہ اعلان کرتا کہ اس سال میں حنا کو شکست دوں گا۔ پہلی پوزیشن میری ہوگی لیکن جب نتیجہ نکلتا تو وہی دوم کا دوم۔

اللہ اللہ کر کے چوتھی جماعت کے رزلٹ کا اعلان ہوا تو بچوں کے دل زور زور سے دھڑکنے لگے۔ ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی اور تمام بچے چوتھی جماعت کی مس کو آنکھیں پھاڑے دیکھ رہے تھے۔ اعلان ہوا "حنا فرسٹ کامران دوم۔" ہر طرف شور مچ گیا۔ بڑی مشکلوں سے مسوں نے بچوں کو خاموش کرایا اور چوتھی جماعت کے بقیہ بچوں کے نتائج سنانا شروع کئے۔ آخر میں ہیڈ مس نے اعلان کیا کہ "جیسا کہ قاعدہ چلا آ رہا ہے رزلٹ کے بعد جو پہلی چھٹی ہوتی ہے اس میں ہم بچوں کے پاس ہونے کی خوشی میں سیر کا پروگرام بناتے ہیں۔ چڑیا گھر، سفاری پارک اور ساحلِ سمندر کی سیر ہم پہلے ہی کر چکے ہیں۔ اس مرتبہ نمائش کا نمبر ہے جہاں میلے کی سیر کے علاوہ آپ سب کو کھیل کود کا بھی خوب موقع ملے گا۔" سارے بچوں نے اعلان سنتے ہی خوشی میں زور دار نعرے لگائے۔ "ایک اعلان اور" ہیڈ مس نے بچوں کو خاموش کراتے ہوئے کہا "چونکہ ہماری سینئر کلاس یعنی چوتھی جماعت آخری سال میں ہے اور آئندہ سال انہیں اس اسکول کا آخری امتحان دینا ہے ہم چاہتے ہیں کہ اس کے رزلٹ آنے پر ہم انہیں ان کی پسند کا

انعام دیں۔ اس کے لئے اس جماعت کو سیر کے بعد صدر بازار لے جایا جائے گا جہاں وہ اپنے لئے پہلا اور دوسرا انعام خود پسند کریں گے۔" اعلان سنتے ہی یوں تو ہر ایک نے اپنی اپنی رائے دینا شروع کر دی لیکن حنا اور کامران کا کچھ اور ہی حال تھا۔ ان کے چہرے مارے جوش کے سرخ ہو رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ابھی سے ہی مقابلہ کے میدان میں اترنا چاہتے ہوں۔

انتظار کر کر کے خیر سے تفریح کا دن آیا۔ تمام بچوں کو اجازت تھی کہ آج وہ یونیفارم کے بجائے اپنی اپنی پسند کے کپڑے پہن کر اسکول آسکتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ بس روانہ ہونے سے قبل اسکول کا میدان رنگے برنگے کپڑے پہنے ہوئے بچوں سے ایسا ہی بھرا ہوا تھا جیسے وہ بھی چاروں طرف لگی پھولوں بھری کیاریوں کا حصہ ہوں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ہر طرف پھول ہی پھول بکھرے ہوئے ہوں۔ گھنٹی بجی اور یہ تمام پھول سمٹ کر بس میں جمع ہو گئے۔ نمائش پہنچ کر تمام بچوں نے دل کھول کر تفریح کی۔ جھولوں پر بیٹھ کے تصویریں اتروائی گئیں۔ طرح طرح کی چٹ پٹی اور مزے دار چیزیں خریدی گئیں اور انہیں خوب مزے لے لے کر کھایا گیا۔ شام سے کچھ پہلے اسکول بس تمام بچوں کو لے کر ان کے گھروں کو روانہ ہو گئی اور چھوٹی وین چوتھی جماعت کے بچوں کو لے کر صدر روانہ ہوئی۔ چوتھی..... اب پانچویں کہنا چاہئے کیونکہ چوتھی تو وہ پاس کر ہی چکے تھے۔ ان کے ساتھ ہیڈ مس اور پانچویں کی کلاس مس بھی تھیں۔ صدر کے بڑے بڑے کئی جنرل اسٹور انہیں دکھائے گئے۔ آخر میں ایک دکان میں داخل ہوتے ہوئے جیسے ہی ان کی نگاہ شیشے کی ایک چھوٹی سی الماری پر پڑی تمام بچے خوشی سے باتیں کرتے ہوئے اس کے گرد جمع ہو گئے۔ یہ ایک چھوٹی سی چوکور الماری تھی جس کے چاروں طرف شیشے لگے ہوئے تھے۔ اور درمیان میں ایک بڑی سی گڑیا اپنے دونوں بازو پھیلائے آہستہ آہستہ دائیں بائیں ناچ رہی تھی۔ کئی بچوں نے یہاں تک کہ حنا اور کامران نے بھی کہا کہ مس یہ گڑیا تو بہت اچھی ہے ہم اسے قریب سے دیکھنا چاہتے ہیں۔ مس کے کہنے پر دکاندار نے وہ گڑیا بچوں کے بالکل سامنے لا کھڑی کی اور اس میں چابی بھر دی۔ چابی بھرتے ہی اب وہ گڑیا نہ صرف ناچنے کے انداز میں دائیں بائیں گھوم آرہی تھی بلکہ اس کے آنکھیں بھی آہستہ آہستہ کبھی بند ہو جاتیں اور کبھی کھل جاتی تھیں۔ ساتھ ہی اس کے اندر سے نہایت دھیمے سروں کے ساتھ گانے کی ہلکی ہلکی آواز بھی گویا چھن چھن کر باہر آرہی تھی جو بہت میٹھی اور دل فریب تھی۔ اسے یوں قریب سے دیکھ جیسے تمام بچوں کو سکتہ ہو گیا۔ وہ بڑی حیرت سے آنکھیں پھاڑے اسے دیکھ رہے تھے۔ پھر مس کی آواز سن کر سب اس خواب سے گویا چونک سے گئے۔ سبھوں نے کہا کہ "مس یہ گڑیا ہمیں چاہئے۔" مس نے گڑیا خریدی۔ ساتھ ہی دوسرے انعام کے لئے سیل سے چلنے والی ایک بڑی خوب صورت سی ریل گاڑی لی جو پلاسٹک کی بنی ہوئی پٹریوں پر دوڑتی تھی۔ اب رات ہو چکی

تھی۔ سب جلدی جلدی صدر بازار سے اپنے گھروں کے لئے روانہ ہوئے۔

دوسرے دن جب اسکول کھلا تو حسبِ معمول کچھ کھسیائے ہوئے اور کچھ جوش میں آکر کامران نے اعلان کیا کہ اگلے رزلٹ پر یہ گڑیا میری ہوگی۔ دیکھنے میں بھی یہی آیا کہ کامران نے دوسرے دن سے ہی جان توڑ محنت شروع کر دی اور شرارتیں کافی حد تک کم۔ گڑیا اگرچہ لڑکوں کے لئے نہیں ہوتی یہ معاملہ کچھ اور تھا اور اس گڑیا میں اتنی خوبیاں جمع تھیں کہ وہ دل و جان سے اسے حاصل کرنے کی کوشش میں لگ گیا۔ کچھ یہ بھی خیال تھا کہ اس اسکول میں ایک بار تو اوّل آ کے دکھا ہی دوں۔ اس کی اس ساری محنت کو دیکھ کر حنا کو بھی فکر ہوئی۔ وہ سمجھ گئی کہ اس بار مقابلہ سخت ہے اور اسے بھی پچھلے سالوں کے مقابلہ میں کچھ زیادہ ہی محنت کرنا ہوگی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اب اسکول سے واپس آتے ہی ہوم ورک کر لیتی۔ اور رات کو پہلی فرصت میں اسکول کے سبق سے آگے سبق امی وغیرہ سے پوچھ پوچھ کے پڑھنا اور یاد کرنا شروع کر دیتی۔ کامران کا مکان اس کے گھر کے سامنے ہی میدان کی دوسری طرف تھا۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ پانچویں میں آنے کے بعد ہی دوسری منزل پر کامران کے کمرے کی لائٹ دیر سے بجھنے لگی تھی۔ اسے خوب پتہ تھا کہ یہ اسے شکست دینے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ غرض کے سال بھر اسی طرح دونوں میں مقابلہ چلتا رہا۔ جب کبھی وہ تھک کر سو جاتے تو یہ گڑیا کبھی کامران کے اور کبھی حنا کے خواب میں آجاتی اور انہیں خوب صورت گیت سناتی۔ انہیں ایسا محسوس ہوتا جیسے وہ ان کے پاس آنے کے لئے بے قرار ہے۔ ان دونوں کا حال اب کسی سے پوشیدہ نہیں رہا تھا۔ سارے اسکول، یہاں تک کہ مسوں کو بھی پتہ چل گیا تھا کہ گڑیا حاصل کرنے کے شوق میں ان دونوں نے ایک دوسرے کو شکست دینے کا فیصلہ کر رکھا ہے۔

خدا خدا کر کے امتحانات آئے۔ تمام بچے خوشی خوشی پرچے دے رہے تھے۔ حنا اور کامران کو تو اب جیسے کسی اور بات سے کوئی مطلب ہی نہیں تھا نہایت خاموش خاموش پرچے کرتے۔ ہاں ہر پرچے کے بعد وہ ایک دوسرے سے یہ پوچھنا نہ بھولتے کہ کیسا ہوا۔ کتنے سوال کئے۔ دونوں کا جواب ایک جیسا ہی ہوتا کہ بہت اچھا ہوا۔ تمام سوال کئے۔ خیر کسی طرح پرچے ختم ہوئے۔ اور رزلٹ کا انتظار ہونے لگا۔ کبھی کبھی ان دونوں کا سامنا ہوتا تو بہت غور سے ایک دوسرے کو دیکھتے۔ دونوں اپنی اپنی جگہ فکر مند نظر آتے۔ خدا خدا کر کے رزلٹ کا دن بھی آیا۔ کلاسوں میں بچے جمع تھے۔ پہلا پیریڈ..... دوسرا پیریڈ، وقت گزرتا رہا۔ دوسری کلاسوں کے مقابلہ میں پانچویں جماعت میں اچھا خاصا شور تھا۔ وجہ یہ تھی کہ ان کی پڑھائی تو ہو نہیں رہی تھی۔ آخری امتحان وہ دے چکے تھے۔ صرف رزلٹ کا انتظار تھا جس کے بعد اب انہیں کسی اور اسکول میں داخلہ لینا تھا۔ تیسرے پیریڈ کے ختم ہوتے ہی ٹن ٹن..... ٹن ٹن کی مسلسل آواز گونجی اور ہر طرف شور مچ گیا۔ تمام بچے میدان کی طرف بھاگے۔ ہر ایک کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ لائنیں

لگ گئی تھیں۔ مسیں سامنے بنے ہوئے اسٹیج پر آچکی تھیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے پہلی کلاس کا رزلٹ سنایا جانے لگا۔ اس کے بعد دوسری تیسری، چوتھی اور اب پانچویں اور آخری جماعت کی باری تھی۔ ہر ایک کی سانس جیسے ان کے حلق میں آکر رک گئی تھی۔ ہر بچہ پانچویں کے نتائج سننے کے لئے بے چین تھا۔ ان کی نگاہیں مس سے زیادہ حنا اور کامران پر تھیں۔ اچانک مس کی آواز بلند ہوئی۔ "کامران اول، حنا دوئم۔" ہر طرف شور مچ گیا۔ کامران نے تو میدان میں ہی خوشی سے اچھلنا کودنا شروع کر دیا۔ حنا کا چہرہ سرخ تھا۔ نگاہیں نیچی اور لبوں پر خاموشی۔ رزلٹ مکمل ہوتے ہی بچے خوشی خوشی اپنے گھروں کو روانہ ہوئے۔ اسکول سے نکلتے وقت کامران نے دیکھا کہ حنا کا چہرہ بہت زیادہ اداس ہو رہا ہے۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کی آنکھوں میں آنسو بھی ہیں۔ کچھ دور تو چپ چاپ اس کے ساتھ چلتا رہا پھر حنا سے مخاطب ہوا۔

"حنا اپنی ریل مجھے دکھاؤ۔"

حنا نے خاموشی سے ریل گاڑی کا پیکٹ اس کی طرف بڑھا دیا۔ کامران نے پیکٹ لیتے ہوئے گڑیا کو حنا کے ہاتھ میں دے دیا۔

"یہ کیا؟" حنا چونکی۔

"یہ گڑیا تمہاری ہے۔" کامران نے جواب دیا۔

"وہ کیسے؟ تم پاگل تو نہیں ہو رہے۔" حنا نے کامران کو جیسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ کچھ ناراض بھی ہو۔

"حنا!" کامران نے آہستہ آہستہ غم بھرے لہجہ میں کہنا شروع کیا۔ "بات دراصل یہ ہے کہ اول تم ہی آئی ہو۔ مجھے کل ۷۲۰ نمبر ملے ہیں اور تمہیں ۷۱۵۔ لیکن مجھے خوب اچھی طرح معلوم ہے کہ تم نے ۷۱۵ کے ۷۱۵ نمبر خالص اپنی محنت سے لئے ہیں جب کہ حساب کے پرچہ میں میں نے ایک سوال خالد کی کاپی سے دیکھ کر نقل کر لیا تھا۔ جو مجھے نہیں آرہا تھا۔ اس طرح میرے اصل نمبروں میں ۱۰ جھوٹے نمبر بھی شامل ہیں۔ جنہیں لینے کا مجھے حق نہیں۔ اب میں اپنی اس حرکت پر بہت شرمندہ ہوں۔ شرم کے مارے کسی اور سے تو نہیں کہہ سکتا تمہیں بتا رہا ہوں۔ اس لئے کہ تمہارا ہی حق میں نے مارا ہے۔ توبہ کرتا ہوں کہ آئندہ اس قسم کی حرکت نہیں کروں گا۔" یہ سب کچھ سن کے حنا کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا ہی رہ گیا۔ وہ اس کی طرف حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ دونوں کی آنکھوں میں آنسو تھے۔۔۔ حنا کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو، کہ اسے کھوئی ہوئی پوزیشن دوبارہ مل گئی۔ اس نے گڑیا کو بے تابی میں سینے سے لگا لیا۔ جب کہ کامران کی آنکھوں میں بھی خوشی کے آنسو تھے۔ اسے محسوس ہوا جیسے اس کا فائنل امتحان تھا جس میں وہ کسی سے پیچھے نہیں رہا۔

مارچ اور

قرار دادِ پاکستان

غلام عباس طاہر

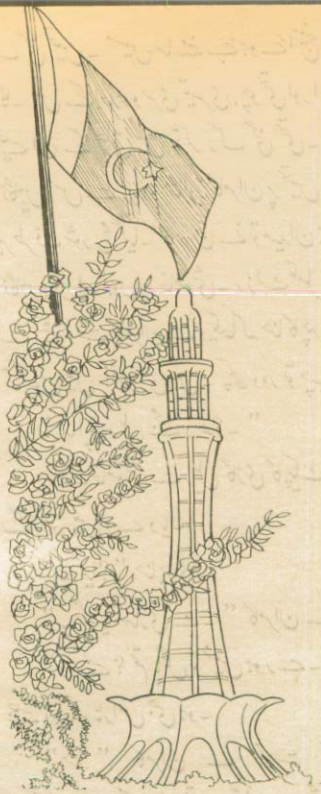

- ..... قرار دادِ پاکستان ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو پیش ہوئی۔
- ..... سنِ ہجری کے مطابق ۳ صفر ۱۳۵۹ھ کو پیش ہوئی۔
- ..... قرار داد پاکستان جمعہ کو پیش کی گئی۔
- ..... ۲۲ مارچ کو سر سکندر حیات نے مسلم لیگ کو جلسہ کی اجازت دینے سے انکار کر دیا لیکن فروری ۱۹۴۰ء میں اجازت مل گئی۔
- ..... قرار دادِ پاکستان منٹو پارک (موجودہ نام اقبال پارک) لاہور میں پیش ہوئی۔
- ..... اس جلسہ کے لئے زیادہ چندہ نواب آف کالا باغ نے دیا۔
- ..... جلسۂ قرار داد میں شرح ٹکٹ اس طرح تھی۔
- ..... ڈائس، سو روپیہ۔ کرسیاں، ۱۰ روپیہ۔ گیلری، ۱ روپیہ۔ فرش ۸ آنے۔ خواتین پردے دار، ۲ روپیہ۔

○ ..... جلسہ کا تاریخی اسٹیج حاجی الف دین نے تیار کیا۔

○ ..... جلسہ گاہ ۱۲ دنوں میں تیار ہوئی۔

○ ..... اسٹیج پر علامہ اقبال کا یہ شعر نمایاں طریقے سے درج تھا۔

جہاں میں اہلِ ایماں صورتِ خورشید جیتے ہیں
اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے، اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے

○ ..... جلسہ میں شرکت کے لئے قائد قائد اعظم ۲۱ مارچ کو دہلی سے لاہور بذریعہ فرنٹیئر میل پہنچے۔

○ ..... قائداعظمؒ نے ریل گاڑی سے اترتے وقت سر سکندر حیات کا ہار پہننے سے انکار کر دیا۔

○ ..... قرار دادِ پاکستان کے پہلے اجلاس کا آغاز سوا گیارہ بجے ہوا۔

○ ..... لاہور میں مسلم لیگ کے اجلاس کے لئے ۲۲، ۲۳، ۲۴ مارچ کی تاریخوں کی تجویز نواب زادہ لیاقت علی خان نے دی۔

○ ..... ۲۲ سے ۲۴ مارچ کے دوران مسلم لیگ کے چار اجلاس ہوئے۔

○ ..... قرار داد پاکستان دوسرے اجلاس میں منظور ہوئی۔

○ ..... اس تاریخی جلسہ میں میاں بشیر احمد کی مشہور نظم "ملّت کا پاسباں ہے محمد علی جناح" انور غازی نے پڑھی۔

○ ..... مارچ ۱۹۴۰ء کو لاہور کے جلسہ میں سر سکندر حیات کو انگریز کا ٹوڈی کہا گیا۔

○ ..... قائد اعظم نے ایک گھنٹہ چالیس منٹ انگریزی میں تقریر کی۔

○ ..... تقریر کے دوران قائد اعظم نے ایک متعصب رہنما لالہ لاجپت رائے کا خط پڑھ کر سنایا۔

○ ..... ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو ہونے والا جلسہ مسلم لیگ کا ۲۷ واں سالانہ جلسہ تھا۔

○ ..... یہ قرار دادِ، قرار داد تقسیم ہند کے نام سے پیش ہوئی اور اسے قرار دادِ پاکستان کا نام ہندو پریس نے دیا۔

○ ..... بیگم محمد علی جوہر نے اسے قرار دادِ پاکستان کہا۔

○ ..... بہادر یار جنگ سے قائد اعظم نے دوبارہ تقریر کرنے کی فرمائش کی۔

○ ..... قرار داد انگریزی زبان میں پیش ہوئی اور اردو میں ترجمہ مولانا ظفر علی خان نے کیا۔

○ ..... ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی نے قائد اعظمؒ سے کہا کہ قرار داد میں سندھ، پنجاب، بلوچستان اور

سرحد کا نام شامل کر دیں۔

○ ..... قرار داد کے سلسلے کی آخری تقریر بہادر یار جنگ نے کی۔

○ ..... قرار داد پاکستان مولوی فضل الحق نے پیش کی۔

○ ..... قرار داد کی منظوری ۲۴ مارچ ۱۹۴۰ء کو دی گئی۔

○ ..... قرار داد کی سب سے پہلے تائید چوہدری خلیق الزماں نے کی۔

○ ..... صوبہ پنجاب سے مولانا ظفر علی خان، صوبہ سرحد سے سردار اورنگزیب، صوبہ سندھ سے حاجی عبداللہ ہارون، صوبہ بلوچستان سے قاضی عیسیٰ خان، صوبہ مدراس سے عبدالحمید خان، صوبہ بہار سے نواب اسماعیل خان، صوبہ بمبئی سے اسماعیل ابراہیم چندریگر، صوبہ سی پی سے عبدالرؤف شاہ، صوبہ یوپی سے سید ذاکر علی نے قرار دادِ پاکستان کی تائید کی۔

○ ..... تائید میں تقرر کرنے والی خاتون بیگم محمد علی جوہر تھیں۔

○ ..... کانگریس کے رہنما راج گوپال اچاریہ نے قرار داد پاکستان کی تائید کی تھی۔

○ ..... جلسہ میں قائداعظم نے اپنی تقریر فی البدیہہ (زبانی) کی تھی۔

○ ..... ۲۱ مارچ کو ریلوے اسٹیشن پہنچنے پر بلوچستان کے مسلم نیشنل گارڈز نے قائداعظم کو سلامی دی۔

○ ..... تحریک پاکستان میں ۲۳ مارچ کو یوم الفرقان کہا جاتا ہے۔

○ ..... قائداعظم نے اس اجلاس میں دو تقریریں کی تھیں۔

○ ..... قرار داد میں پاکستان کا لفظ ایک بار بھی نہ آیا بلکہ بیگم محمد علی جوہر نے اپنی تقریر میں پاکستان کا ضمناً ذکر کیا۔

○ ..... اجلاس کے نظم و ضبط کے لئے سرحد سے سردار اورنگزیب نے سو رضا کار بھیجے۔

○ ..... بہادر یار جنگ کی تقریر سن کر قائداعظم نے مائک پر آکر کہا تھا "ان کے بعد کسی اور کا کچھ کہنا غلط ہو گا۔"

○ ..... قرار دادِ پاکستان کی زیادہ مخالفت لندن ٹائمز اخبار نے کی۔

○ ..... ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو جب قائداعظم تقریر کر رہے تھے تو مولوی فضل الحق (شیر بنگال) کی آمد پر جلسہ گاہ میں سب سے زیادہ شور اور نعرے بازی کی گئی۔

○ ..... اس تاریخی جلسہ میں تقریباً ایک لاکھ افراد شریک ہوئے۔

اُستاد ۱۲ ½

محمد پرویز آرائیں

بس ہم ذرا بڑے ہوئے تھے کہ امّی و ابّا نے صلاح و مشورہ کر کے لاڈ و پیار ختم کر کے پڑھنے کی طرف لگا دیا۔ محلے کے ایک کونے میں پرائمری سکول تھا اور ایک کونے میں استاد ساڑھے بارہ کا مدرسہ، ہمیں استاد ساڑھے بارہ کی شاگردی میں دے دیا گیا۔ استاد ساڑھے بارہ کے متعلق جاتے ہی معلوم ہوا کہ ماسٹر فولاد بخش بھی کہلاتے ہیں۔ بخار، نزلہ، کھانسی انہیں آج تک کبھی نہیں ہوئے۔ خود بیمار نہیں ہوتے اس لئے کسی کو بھی بیمار ہونے نہیں دیتے۔ اگر کوئی بیمار ہو جائے تو بید سے اتنی مرمت کرتے ہیں کہ ہاتھوں ہاتھ وہ بھلا چنگا ہو کر سبق یاد کرنے لگتا ہے۔

ایک روز استاد نے ایک لڑکے سے پوچھا۔ "طارق دال کدھر ہے جلدی بتا؟"

استاد جی "سب کھالی، کل لیتا آؤں گا۔"

خوب پٹائی ہوئی طارق صاحب کی۔ اس لئے نہیں کہ دال قاعدے میں نہیں گھر پر بتائی تھی بلکہ اس لئے کہ قورمے کی بجائے کم بخت دال لانے کی بات کر رہا تھا۔

ہماری باری آئی۔ "جیم چے کہاں ہے؟"

ہم نے قاعدہ اوپر سے دیکھا تھا۔ اندر سے نہیں۔ اللہ کا نام لے کر ایک خانہ میں انگلی رکھ دی۔ ہائیں..... کی آواز کانوں سے سنی، ایک دھماکہ ہوا اور معلوم ہوا کہ کمر کی کھال ہوا میں اڑ گئی۔ وجہ یہ تھی کہ ہم نے جیم یا چے کی بجائے انگلی وہاں رکھ دی تھی جہاں لکھا تھا، عمدہ سپارے اور قاعدے مولا بخش سے خریدیئے۔

یہ پہلی پٹائی تھی۔ روتے بسورتے گھر پہنچے تو کسی نے ہمدردی نہ جتائی۔ بس اتنا کہا کہ سبق یاد کر لیا کرو ورنہ اس سے بھی زیادہ کھال ادھڑے گی۔ سب کے سب نگاہیں پھیر رہے تھے۔ اگر واقعی دو چار دن یہی حالت رہتی تو اپنی ہڈیاں بوٹیاں سب برابر ہو جاتیں۔ راتوں رات سوچا اور استاد ساڑھے بارہ کو راستے پر لانے کا ارادہ کر لیا۔

سر اٹھا کر سینہ تان کر قاعدہ سنبھال کر مدرسے کی طرف لپکے۔ دو چار ہی لڑکے آئے تھے۔ ہم نے قاعدہ سنبھالا اور رٹائی شروع کر دی۔

استاد نے اتنی توجہ سے پڑھتے دیکھا تو بولے۔ "ابے نواب اتنے سویرے کیسے آ گیا؟"

اب ہم نے ایکٹنگ شروع کی۔ "استاد جی صبح بریانی کے لئے گوشت، چاول اور زعفران لینے گیا تھا اس کے بعد گھر میں بیٹھنے کی بجائے سیدھا ادھر ہی آ گیا ہوں۔"

استاد نے جلدی سے اشارہ کر کے قریب بلایا اور کہا۔ "اپنا حصہ بھی ہے ناں، نواب صاحب؟" جی ہاں"..... جھوٹ پر جھوٹ بولا۔

"شاباش"..... انہوں نے بڑے پیار سے کمر تھپک دی۔

جا کر اپنی جگہ بیٹھ گیا۔ استاد صاحب بار بار اپنی زبان ہونٹوں پر پھیر رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد مجھے پھر بلایا۔ "بریانی میں کیوڑا بھی ڈلوایا ہے یا نہیں؟"

"نہیں استاد جی!"

"ابے پھر کیا مزہ آئے گا۔ جا جلدی سے گھر جا اور کیوڑے کے لئے پیسے لے کر کیوڑہ لا کر دے ورنہ سارہ مزہ جاتا رہے گا، جا جلدی جا۔"

چھٹی مل گئی۔ پورے تین گھنٹے گلی ڈنڈا کھیلنے کے بعد مدرسے کی بجائے گھر پہنچے۔ امی سے کہا کہ استاد جی نے کہا ہے کہ آج شام کو بریانی پکا کر لانا۔

امی نے بُرا سا منہ بنایا۔ "دو اور دو چار دن کا شاگرد اور اتنی بڑی فرمائش۔ خیر اب کہا ہے تو پکا دوں گی۔ شام کو لے جانا۔"

اتنی دیر بعد مدرسے پہنچے۔ استاد نے کوئی خیال نہ کیا۔ انہیں بتایا کہ کیوڑہ دے آیا ہوں تو مسکرائے اور چُپ رہے۔

چار بجے چھٹی ملی تو استاد نے پچکارا۔ "بڑے اچھے بچّے ہو۔ سبق تو فر فر یاد کرتے ہو۔ دیکھو میں رات کو کھانا جلدی کھا لیتا ہوں۔ تم میرے حصے کی بریانی سات بجے تک لے آنا سمجھے۔" ہم کیا سمجھے کیا نہ سمجھے۔ یہ ایک الگ بات تھی۔ بس رہ رہ کر اپنے آپ پر غصہ آ رہا تھا۔ ذرا سی پڑھائی اور پٹائی سے بچنے کے

لئے خواہ مخواہ استاد کی بریانی کی دعوت کر دی۔ اس غصے کو اتارا کیسے جاتا۔ سوچا بریانی میں برابر کی مرچیں ملادی جائیں، پسا ہوا نمک ملا دوں۔ لیکن ان دونوں صورتوں میں استاد کی شکایت پر گھر والوں کو اصلیت کا پتہ چل جاتا۔ شام قریب آگئی تھی۔ بریانی کی خوشبو ناک میں گھسی جارہی تھی اور میں استاد کو مزہ چکھانے کا طریقہ ڈھونڈھ نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کوئی بھی طریقہ ذہن میں نہ آیا۔

ہار مان کر اٹھا۔ سوچا چلو دے آؤں بریانی استاد کو۔ طباق میں استاد کا حصہ نکالا رکھا تھ۔ دستر خوان کی تلاش میں بھابھی جان کے کمرے میں گیا۔ وہاں چمکتی برف جیسی پیرافین کی ایک پونڈ کی سر بند بوتل رکھی تھی۔ جس کے متعلق مجھے معلوم تھا کہ یہ کیا ہے اور کیا کرتی ہے۔ چمکتے پیرافین نے مجھے روک لیا۔ ایک خیال آیا اور میں نے پیرافین کی پگھلی سی برف کی بوتل کو دستر خوان میں لپیٹ لیا۔ اور پھر زینے سے اترتے ہوئے بوتل کھول کر ساری کی ساری بریانی کے طباق میں انڈیل دی۔

استاد میرا ہی انتظار کر رہے تھے۔ لپک کر طباق سنبھالا اور دستر خوان بچھا کر کھانا شروع کر دیا۔ میں کھسک آیا۔ دل ہی دل میں ہنس رہا تھا کہ اب مزہ آئے گا بریانی کھانے کا پیٹ میں بلیاں چوہے ناچیں گے۔ کھایا پیا سب برابر ہو جائے گا۔

گھومتا پھرتا گھر آیا۔ سب نے رات کا کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد بڑی آپا اور بھابھی جان آپس میں باتیں کرنے لگیں۔ بھابھی نے کہا۔ "آپا پڑھا تم نے آج کے اخبار میں ایک عورت نے پیرافین کے دو چار چمچے زیادہ پی لئے تو اتنے جلاب آگئے کہ بے چاری مر گئی۔"

اچھا..... "آپا نے کہا اور میرا دل دھڑکا۔ ہاں..... بھئی میں نے تو خود خبر پڑھنے کے بعد ڈر کے مارے ننھے کو ایک چمچہ بھی نہیں دیا۔ پیرافین کی بوتل بند کی بند رکھ آئی ہوں۔ ان کے ابّا آکر خود ہی دیں گے۔"

اب بڑی آپا بھی سنبھل گئی تھیں۔ انہوں نے گرہ لگائی۔ "ابھی کل ہی کی بات ہے کہ راجو کے ننھے نے پیالی بھر پیرافین پی لی تھی۔ ہفتہ بھر ہسپتال میں پڑا رہا۔ ہزاروں خرچ ہوئے۔ تب جا کر تندرست ہوا اور گھر واپس آیا۔"

اور پھر نہ جانے کہاں کہاں سے ایسے قصے یاد آتے گئے۔ میرا پلنگ مجھے اڑن کھٹولا معلوم ہونے لگا۔ پیروں میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ دل ڈوبا کہ ڈوبا۔ پسینے اتنے آگئے کہ قمیص تر بتر ہو گئی "اے اللہ اب کیا ہو گا۔ اللہ میاں اب کیا ہو گا۔"

آنکھوں کے سامنے استاد ساڑھے بارہ مرے پڑے تھے۔ بریانی کا خالی طباق گواہ بنا سامنے رکھا تھا اور میں ہتھکڑیوں میں جکڑا کھڑا تھا اور پولیس والوں نے چاروں طرف سے مجھے گھیر رکھا تھا۔ میں نے ایک

زور کی چیخ ماری۔ اتنے زور سے کہ سارا گھر ہل گیا۔ سب سوتے جاگتے دوڑے۔ سمجھا گیا کہ سوتے سوتے خواب دیکھ کر ڈر گیا ہوں۔ کسی نے پچکارا، کسی نے کمر سہلائی، کسی نے گلاس بھر پانی پلایا، میں بار بار کہتا رہا۔ "استاد مر گئے۔ آپا جی استاد مر گئے۔ امی جی استاد چلے گئے۔ میں نے انہیں مار دیا۔"

"ڈر گیا ہے۔ ڈر گیا ہے ..... امی بولیں۔ چاول کھا کر چت سو گیا تھا۔ شاید کھانا ہضم نہیں ہوا۔"

امی نے جلدی سے سونف الائچی پودینے کی چائے بنا کر زبردستی پلائی اور یہی کہتی رہیں کہ کچھ نہیں ہوا تم ڈر گئے ہو۔ سو جاؤ ڈراؤنا خواب دیکھ لیا ہے۔

کس سے کہتا کہ خواب نہیں حقیقت ہے جو کہہ رہا ہوں ٹھیک ہے لیکن کوئی مانتا ہی نہیں تھا۔ نہ جانے کب سویا۔ آنکھ کھلی تو اچھی خاصی صبح تھی۔

جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ استاد کا خیال آیا۔ وہ تو کب کے مر چکے ہوں گے۔ ایک بوتل پیرافین تو ان کے سب گھر والوں کو سلا سکتی تھی اور وہ تو اکیلے بالکل اکیلے ہی طباق پر جھکے تھے۔ ناشتہ کر کے مدرسہ جانے کے لئے اٹھا۔ قدم اٹھ نہیں رہے تھے۔ آنکھوں کے سامنے استاد کا بھاری بھر کم جنازہ آتا جاتا دکھائی دے رہا تھا۔

رونی صورت بنا کر مدرسے کی طرف چل پڑے۔ یہ سوچ لیا تھا کہ استاد کو مرا دیکھتے ہی خوب روؤں گا۔ خوب ہی روؤں گا کیوں کہ میں نے ہی انہیں مارا ہے۔

مدرسہ بڑے زور سے چل رہا تھا۔ میں نے آنکھیں جھپکائیں۔ استاد وہیں ..... سچ بالکل وہیں اپنی لگی بندھی جگہ بیٹھے سر ہلا رہے تھے۔ بالکل ویسے ہی تھے۔ جیسا کل دیکھا تھا۔ رتی بھر فرق نہ تھا۔ مجھے دیکھ کر انگلی سے اشارہ کیا۔ "ادھر آؤ۔"

میں نے سوچا یہ تو بچ گئے ہیں اب اپنا بچنا مشکل ہے۔ بدلہ لئے بغیر نہیں چھوڑیں گے۔ "پہلے کھال ادھڑے گی پھر ہڈیوں کا چورا ہو گا اور ....."

گھگھیا کر کہا۔ "استاد جی وہ میں نے نہیں کیا وہ تو یوں ہوا کہ ....."

وہ کچھ مسکرا کر بولے۔ "ادھر آ تو نے ہی تو بریانی لا کر کھلائی تھی۔ اتنا گھی اتنی چکنائی کیوں ڈلوائی تھی۔ ذرا کم ہونا چاہئے تھی۔ آئندہ خیال رکھنا۔ ویسے کچھ بُرا نہیں ہوا۔ مدت سے پیٹ میں بوجھ تھا ایک دو دفعہ لوٹا سنبھالنا پڑ گیا آج ..... چلو خیر ....."

اور میری آنکھ کے سامنے دس روپے بارہ آنے کی پوری بھری بوتل منہ بسور کر رہ گئی لیکن آئندہ کسی کے ساتھ ایسا کرنے سے توبہ کر لی۔

لوٹ پیچھے کی طرف

بنتِ یامین

اس روز ملک کے تمام اخبارات میں ایک خبر نمایاں طریقے سے شائع ہوئی تھی اور خبر ایسی تھی جس نے سارے ملک کو چونکا دیا تھا۔ خبر یہ تھی کہ ڈاکٹر شہریار ایک انتہائی اہم اعلان کرنے والے ہیں۔ چونکہ ڈاکٹر شہریار ملک کے چند مشہور سائنس دانوں میں سے ایک تھے اور انہوں نے اپنے ملک کے لئے بہترین خدمات انجام دی تھیں، بہت سی ایجادات بھی کی تھیں، لہٰذا ان کی جانب سے اہم اعلان کی خبر فوراً موضوعِ گفتگو بن گئی۔

شہر کے تعلیمی ادارے ہوں یا بازار، گھر ہوں یا چائے خانے، کوئی جگہ ایسی نہ تھی جہاں اس کا چرچا نہ ہو۔

"میرا خیال ہے ہمارا ملک بھی ایٹم بم بنانے میں کامیاب ہو گیا ہے۔" ایک کہتا۔

"میاں! ایٹم بم تو ہم کب کا بنا چکے ہیں ..... یہ تو کوئی دوسرا ہی معاملہ ہے۔" دوسرا کہتا۔
"پھر کیا بات ہو سکتی ہے؟"
"اللہ ہی جانے۔"

پورا شہر اسی طرح کی چہ میگوئیوں میں مصروف تھا اور سب اس انتظار میں تھے کہ دیکھئے کب اور کیا اعلان ہوتا ہے۔

بالآخر اعلان ہوا کہ اس مہینے کی سترہ تاریخ کو ڈاکٹر شہریار ایک پریس کانفرنس سے خطاب کریں گے۔ سترہ تاریخ کے انتظار میں لوگ ایک ایک دن گن گن کر کاٹ رہے تھے۔ شہر پر تجسّس کی فضا چھائی ہوئی تھی۔

..... ○ ..... ○ ..... ○ .....

کانفرنس روم صحافیوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا اور ڈاکٹر شہریار کی باوقار آواز پورے ہال میں گونج رہی تھی۔

میری طرف سے اہم اعلان کی خبر پڑھ کر عوام میں طرح طرح کی قیاس آرائیاں شروع ہو گئی ہیں چونکہ میں زیادہ تر دفاعی نوعیت کی ایجادات کرتا رہتا ہوں لہٰذا یہ سمجھا گیا کہ شاید ایسی ہی کسی ایجاد کے متعلق اعلان کرنا چاہتا ہوں، لیکن ایسا نہیں ہے۔" ڈاکٹر شہریار نے رک کر صحافیوں پر نگاہ ڈالی اور پھر کہا، "لیکن یہ اعلان ایک ایجاد ہی سے متعلق ہے۔ دراصل اس ایجاد کا تعلق عوام کی زندگی سے ہے۔"

پورے کمرے پر سکوت طاری تھا۔ ڈاکٹر شہریار کی آواز پھر کمرے میں گونجنے لگی۔

"میں نے مشاہدہ کیا ہے کہ ہمارے یہاں کام کی سست رفتاری کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ لوگ اپنی موجودہ زندگی سے خوش نہیں ہیں اور چڑچڑاپن ان پر غالب ہے۔ ان کو اپنی ماضی کی زندگی ایک حسین خواب کی طرح نظر آتی ہے۔ میں ایک ایسی دوا ایجاد کرنے میں کامیاب ہو گیا ہوں جو ان کو ان کی پسندیدہ زندگی میں واپس بھیج دے گی۔"

پورا ہال طرح طرح کی آوازوں سے گونجنے لگا۔

"لیکن سر آپ ایک بوڑھے آدمی کو کیسے جوان کر سکیں گے؟" ایک صحافی نے سوال کیا۔

"دیکھئے یہ تبدیلی جسمانی طور پر نہیں ہوگی بلکہ اس کا ذہن جوان ہو جائے گا اور وہ ایک نئے جوش اور ولولے کے ساتھ قوم کی خدمت کر سکے گا۔"

"مگر یہ کیسے ممکن ہے؟" بیک وقت کئی لوگ بول اٹھے۔

"دیکھئے ہمارا ذہن بالکل ایک کیسٹ کی طرح ہوتا ہے۔ ابتداء میں یہ بالکل سادہ ہوتا ہے مگر جیسے جیسے واقعات رونما ہوتے ہیں یہ اس میں ریکارڈ ہوتے جاتے ہیں۔ جس طرح آپ اپنا پسندیدہ گانا ریوائنڈ کر کے سن لیتے ہیں بالکل اسی طرح میری دوا کے استعمال سے آپ اپنی پچھلی زندگی میں پہنچ سکیں گے مگر فرق صرف اتنا ہو گا کہ اس زندگی کے بعد جو واقعات ہوئے ہوں گے وہ آپ کی میموری (Memory) سے صاف ہو جائیں گے اور نئے رونما ہونے والے واقعات اس پر ریکارڈ ہوتے جائیں گے اور اس طرح ایک نئی زندگی کا آغاز ہو گا۔"

"مگر اس دوا تک عام افراد کی پہنچ کیسے ہوگی؟" ایک صحافی نے سوال کیا۔

"اس دوا کی لاگت بہت کم آئے گی۔" ڈاکٹر شہریار بولے۔ "اس سلسلے میں لوگوں سے درخواستیں وصول کروں گا کہ وہ کس عمر کی حد تک واپس جانا چاہتے ہیں اسی حساب سے ان کو دوائیں مہیا کی جائیں گی۔"

پریس کانفرنس کے اختتام کے بعد جب صحافی باہر نکلے تو باہر موجود عوام کے ہجوم نے ان کو گھیرے میں لے لیا اور ان سے اس پریس کانفرنس کے متعلق تفصیلات پوچھنے لگے۔

..... ○ ..... ○ ..... ○ .....

درخواست جمع کرانے والوں کا ایک اژدہام تھا جو ڈاکٹر شہریار کے بنگلے پر ٹوٹا پڑ رہا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کو درخواست وصول کرنے کے لئے ایک پورے عملے کا انتظام کرنا پڑا تھا اور کسی قسم کی بدمزگی سے بچنے کے لئے قانون نافذ کرنے والے اداروں کو بھی طلب کرنا پڑا تھا۔ ایسا لگتا تھا پورا شہر درخواست جمع کرانے کے لئے ٹوٹ پڑا ہے۔ اور حقیقت بھی یہی تھی۔

پندرہ دن تک درخواستوں کی وصولی کا سلسلہ جاری رہا۔

شہر کے لوگ اب سراپا انتظار بنے ہوئے تھے کہ دواؤں کی تقسیم کا سلسلہ کب شروع ہوتا ہے۔ عوام کی بیتابی اب عروج کو پہنچی ہوئی تھی۔ اس سے پہلے کہ دواؤں کی تقسیم کا سلسلہ شروع ہوتا ڈاکٹر شہریار کی طرف سے ایک اور پریس کانفرنس کا اعلان ہوا۔

پہلے کی طرح ایک دفعہ پھر وہ کمرہ صحافیوں سے کھچا کھچ بھر گیا۔ ڈاکٹر شہریار نے بولنا شروع کیا۔

"بات دراصل یہ ہے کہ میں نے اپنا دواؤں والا پروگرام ترک کر دیا ہے۔"

"ترک کر دیا ہے؟ مگر کیوں؟" صحافیوں میں سے کسی نے حیرت سے سوال کیا۔

"اگر یہ کرنا ہی تھا تو درخواستیں وصول کرنے کی کیا ضرورت تھی؟" کوئی بولا۔

ابھی یہ چہ میگوئیاں جاری تھیں کہ ڈاکٹر شہریار کی آواز پھر گونجنے لگی، "یہ پروگرام شروع کرنے سے پہلے میں بھی اس کے نتائج سے آگاہ نہیں تھا مگر درخواستیں وصول کرنے کے بعد میری عقل ٹھکانے آگئی ہے۔ تقریباً سارے شہر نے اپنی درخواستوں میں لکھا ہے کہ وہ اپنے بچپن کے زمانے میں واپس جانا چاہتے ہیں۔ آپ خود ہی سوچئے کہ اگر ایسا ہو گیا تو معاشرے کے توازن کا کیا ہو گا۔ دفتروں کے کام اور انتظامی امور کون سنبھالے گا۔ صنعتیں کون چلائے گا۔ گھر والوں کے لئے کون کما کر لائے گا۔ لیکن اس بات سے ایک اندازہ اور ہوا ہے مجھے۔"

"وہ کیا؟"

"وہ یہ کہ بلاشبہ بچپن کا زمانہ ہی وہ زمانہ ہے جسے بہترین زمانہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ جبھی تو سب لوگ اس کے حصول کے لئے کوشاں تھے۔ کسی شاعر نے اس زمانے کے لئے ٹھیک ہی کہا ہے کہ ؎

آزاد ہیں فکروں سے غم پاس نہیں آتا
ہنستے ہیں تو رونے کا پیغام نہیں آتا

پریس کانفرنس کے اختتام پر صحافی باہر نکلے تو ان میں سے کچھ کے چہرے پر اطمینان تھا اور کچھ کے چہرے مایوسی سے لٹکے تھے۔ نامعلوم کیوں؟

اچھے اخلاق

لڑکا جب اسکول سے پڑھ کر گھر میں داخل ہوا تو اس کی ایک آنکھ چوٹ کی وجہ سے سوجی ہوئی تھی جب ماں نے اس کی وجہ پوچھی تو روتے ہوئے کہنے لگا، "مجھے ایک بڑے لڑکے نے گھونسا مارا ہے۔" ماں نے یہ سن کر کہا "بیٹا لڑنا بھڑنا اچھی بات نہیں اگر اس نے غلطی کی ہے تو تمہارے لئے لازم ہے کہ اچھے اخلاق کا ثبوت دو۔ کل اس کے لئے ایک کیک لے جاؤ اور آپس میں صلح صفائی کرلو۔"

دوسرے دن جب وہ اسکول سے واپس آیا تو اس کی دوسری آنکھ سوجی ہوئی تھی ماں نے حیرت سے پوچھا "آج کیا ہوا ہے؟"

"اب وہ ایک اور کیک مانگتا ہے۔" لڑکے نے روتے ہوئے بتایا۔

نسیم انور فیصل آباد

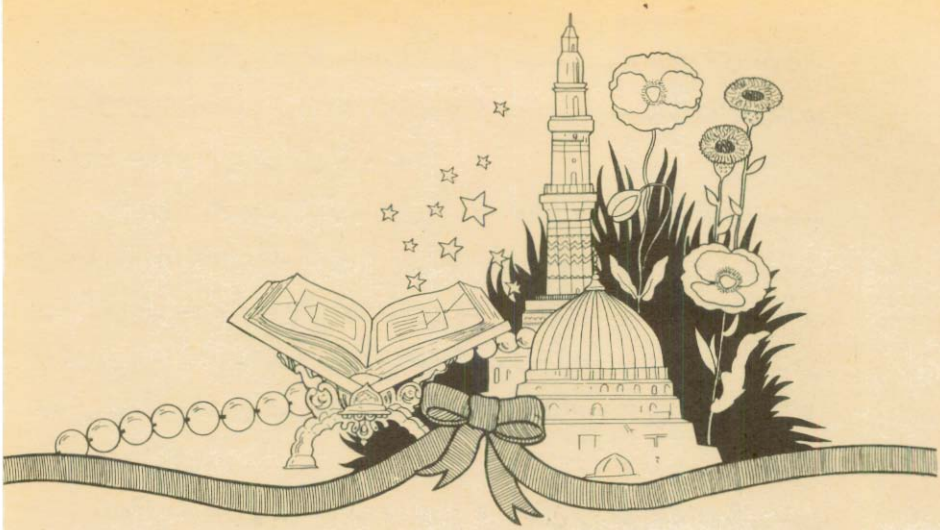

روزہ صرف بھوکا رہنے کا نام نہیں

ساجد سعید

آج گھر میں ہر کوئی دعوت کی تیاری میں لگا ہوا تھا۔ نمکین اور میٹھے پکوانوں کی خوشبو گھر کی فضا میں رچی ہوئی تھی۔ سب سے زیادہ خوشی سومی کو تھی کیونکہ آج اس کی روزہ کشائی تھی اور اس کی بہت سی سہیلیاں اور رشتہ دار اس موقع پر آنے والے تھے۔ سومی کو خوشی میں بھوک اور پیاس کا بھی احساس نہ رہا تھا۔

عصر کی نماز کا وقت ہو گا جب امی اور آپی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ باورچی میں لگی ہوئی تھیں اور سومی عصر کی نماز سے فارغ ہو کر جاء نماز کو اپنی جگہ رکھنے جارہی تھی کہ اچانک نانی جان جو کہ تسبیح ہاتھ میں لئے اللہ اکبر الحمد اللہ اور سبحان اللہ کے ورد میں لگی ہوئی تھیں سومی کو اپنے پاس بلایا تاکہ سومی کو بتاسکیں کہ روزہ صرف کھانے پینے سے پرہیز کا نام نہیں بلکہ اس کے اور بھی کچھ تقاضے ہیں۔

"بیٹی، آج تمہاری روزہ کشائی ہے اور یقیناً تمہیں ہم سب میں سب سے زیادہ خوشی ہوگی کیونکہ تم نے پہلی مرتبہ روزہ رکھا ہے اسی مناسبت سے میں آج تم کو روزہ کے بارے میں کچھ بتاؤں گی کہ روزہ دراصل کیا ہے اور یہ ہم پر کیوں فرض کیا گیا ہے۔"

"ضرور، ضرور نانی جان" صبوحی نے خوش ہو کر کہا۔ وہ واقعی جاننا چاہتی تھی۔ اسے روزے کے بارے میں کچھ زیادہ معلوم نہ تھا۔ "دیکھو بیٹی یوں تو اللہ تعالیٰ نے ہم پر بہت سی عبادات فرض قرار دی ہیں۔" نانی جان نے کہنا شروع کیا ان عبادات میں ہر ایک کا اپنی جگہ الگ فائدہ ہے لیکن ان میں بعض عبادتیں ایسی ہیں جو نہ صرف انسان کی روحانی بلکہ اخلاقی تربیت بھی کرتی ہیں۔ نماز ہی کو لے لیجئے۔ دن رات میں پانچ وقت کی نمازوں سے نہ صرف اللہ کی یاد تازہ رہتی ہے بلکہ ہم دیگر اخلاقی برائیوں سے بھی کافی حد تک بچے رہتے ہیں۔

روزہ بھی انہی عبادتوں میں سے ایک عبادت ہے جو مسلمانوں پر ہر سال ایک مہینے یعنی رمضان المبارک میں فرض کئے گئے ہیں جس میں ہم صبح صادق سے غروب آفتاب تک کھانے پینے سے پرہیز کر کے اللہ کے نزدیک محبوب بندے بن سکتے ہیں۔

رمضان المبارک اسلامی کلینڈر کے لحاظ سے نواں مہینہ ہے۔ رمضان کے متعلق اللہ کا ارشاد ہے "اے لوگوں تم پر روزے فرض کئے گئے جس طرح تم سے پہلے کی امتوں پر فرض کئے گئے تھے تاکہ تمہارے اندر تقویٰ کی صفت پیدا ہو۔ اسلام کے اکثر احکام کی طرح روزے بھی آہستہ آہستہ مسلمانوں پر فرض کئے گئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شروع شروع میں مسلمانوں کو ہر مہینے تین روزے رکھنے کی تلقین فرمائی مگر اس وقت یہ روزے فرض نہ تھے۔ پھر بعد میں قرآن میں روزوں کی فرضیت کے بارے میں حکم باری تعالیٰ نازل ہوا۔

رمضان نہ صرف انسان کے اندر تقویٰ کی صلاحیت پیدا کرتا ہے بلکہ دوسری طرف یہ جسمانی صحت کو بھی بحال رکھنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ ہمارا معدہ جو ہمارے جسم میں اہم کردار ادا کرتا ہے پورے گیارہ مہینے کھانے پینے کی وجہ سے کمزور ہو چکا ہوتا ہے۔ وہ اس مہینے میں کھانے پینے کے پرہیز سے دوبارہ توانا ہو جاتا ہے۔

قرآن مجید جو کہ اسی مہینے نازل ہوا انسانوں کے لئے سراسر ہدایت کا سرچشمہ ہے اور یہ ایسی واضح تعلیمات کا مجموعہ ہے جو حق اور باطل کا فرق کھول کر رکھ دینے والی ہیں۔

لہٰذا یہ ہم پر فرض ہے کہ اگر ہم اس مہینہ کو پائیں تو قرآن پاک کی تعلیمات کی روشنی میں اس مہینے کو بہتر سے بہتر گذارنے کی کوشش کریں۔

رمضان المبارک کے بارے میں حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ میری امّت کو پانچ چیزیں رمضان کے بارے میں خصوصی طور پر عطا کی گئی ہیں جو پچھلی امتّوں کو نہیں دی گئیں۔ (۱) ان کے منہ کی بدبو (روزہ دار) اللہ کے نزدیک مشک سے زیادہ پسندیدہ ہے۔ (۲) دریا کی مچھلیاں ان کے لئے دعا کرتی ہیں۔ (۳) جنت ان کے لئے ہر روز آراستہ کی جاتی ہے۔ (۴) اس مہینے میں سرکش شیاطین قید کر دیئے جاتے ہیں۔ (۵) رمضان کے آخری عشرے میں روزہ داروں کے لئے مغفرت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں۔

"نانی جان، یہ شب قدر کیا چیز ہے؟" سومی نے پوچھا۔

اس مہینے کے آخری عشرے کی پانچ طاق راتوں یعنی ۲۱، ۲۳، ۲۵، ۲۷ اور ۲۹ میں سے اللہ ایک رات ایسی عطا فرماتا ہے کہ جو ہزاروں راتوں سے افضل ہے۔ یعنی کہ ہزاروں راتوں کی عبادت ایک طرف اور اس رات کی عبادت ایک طرف، حضرت سلمانؓ روایت کرتے ہیں کہ حضورؐ نے شعبان کی آخری تاریخ کو ارشاد فرمایا کہ تم پر ایک مہینہ ایسا آرہا ہے جو بہت بڑا اور مبارک مہینہ ہے اور اس میں ایک رات ایسی ہے جو ہزاروں راتوں سے بڑھ کر ہے۔ اس مہینہ میں اللہ تعالیٰ مومن کے رزق میں اضافہ کر دیتا ہے۔ اور اس مہینہ میں ایک فرض ادا کرنے کا ثواب ستّر فرضوں کے برابر ملتا ہے۔ یعنی اس مہینہ میں صرف ایک دن کی پانچ وقت کی نمازیں ادا کرنے سے ہم تین سو پچاس فرضوں کے مستحق بن سکتے ہیں۔ حضرت پر زبور، حضرت موسیٰ پر توریت اور حضرت عیسیٰ پر انجیل بالترتیب اسی مہینے میں ۱۲ یا ۱۸، ۶، ۱۲ یا ۱۳ رمضان کو نازل ہوئیں۔

حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ تین آدمیوں کی دعا رد نہیں کی جاتی ان میں ایک روزہ دار کی افطار کے وقت کی دعا بھی شامل ہے۔ رمضان کے روزوں کو بلا کسی شرعی عذر کے چھوڑ دینا سخت گناہ ہے اگر اس کی قضا کے بدلے وہ ساری عمر بھی روزے رکھے تو وہ اس ایک روزے کا بدل نہیں ہو سکتے۔"

"نانی جان روزے کتنے قسم کے ہوتے ہیں اور کب کب رکھے جاتے ہیں۔؟" سومی نے سوال کیا۔ دادای جان نے جواب دیا۔

"بیٹی، روزے کی چھ قسمیں ہیں۔ فرض، واجب، سنّت، نفل، مکروہ، اور حرام۔ فرض روزوں

میں رمضان کے تیس روزے ہم پر فرض ہیں۔ جو شخص ان کی فرضیت کا انکار کرے وہ کافر ہے۔ رمضان کے روزے اگر کسی غفلت یا پھر کسی شرعی عذر کی وجہ سے رہ جائیں تو ان کی قضا واجب ہے۔ نذر اور کفّارے کے روزے واجب ہیں۔ جو روزے آپؐ نے خود رکھے یا جس کو رکھنے کی تلقین فرمائی وہ روزے سنّتی ہیں۔ نفلی روزوں میں ماہ شوال کے چھ روزے، پیر اور جمعرات کا روزہ، ماہ شعبان کی پندرھویں تاریخ کا روزہ اور ذوالحجہ کے ابتدائی عشرے کے آٹھ روزے شامل ہیں۔ مکروہ روزوں میں سنیچر اور اتوار کے دن کے روزے، صرف یوم عاشورہ کا روزہ رکھنا اور مسلسل روزے رکھنا شامل ہیں۔ عید الفطر کے دن کا روزہ عید الاضحیٰ کے دن کا روزہ ایام تشریق، ذوالحجہ کے روزے رکھنا حرام ہیں۔

مختصر یہ کہ رمضان کے روزے مسلمانوں کے لئے مسلسل تربیت کا ذریعہ ہیں۔ حدیث میں بھی ہے کہ "روزہ برائیوں کے خلاف ڈھال ہے۔" اس مہینہ میں مومن خود کو غیبت، چغلی، جھوٹ، غلط بیانی، شور ہنگامہ جیسی برائیوں سے بچنے کی کوشش کرتا ہے۔ تاکہ روزے اس کے لئے اجر و ثواب کا ذریعہ بن جائیں اور آخرت کے دن اس کو شرمندگی نہ اٹھانی پڑے۔

ابھی نانی جان کی گفتگو جاری تھی کہ امی جان نے دونوں کو دسترخوان کی طرف آنے کو کہا۔ سومی کے اندر ایک عجیب سی روحانی خوشی جنم لے چکی تھی اسے اب معلوم ہوا تھا کہ روزہ رکھ کر اس نے اپنے اللہ کو خوش کیا ہے۔

گھر اور جنّت

ایک دن ماسٹر صاحب نے بچوں سے پوچھا، "کون کون جنت میں جائے گا ہاتھ اٹھاؤ" سب بچوں نے ہاتھ اٹھالیا لیکن ایک بچے نے ہاتھ نہیں اٹھایا۔ ماسٹر صاحب نے پوچھا "تم جنت میں کیوں نہیں جاؤ گے؟" بچے نے بڑی معصومیت سے جواب دیا "میری امی نے کہا تھا کہ کہیں نہیں جانا سیدھا گھر آنا۔"

فہد آفتاب - کراچی

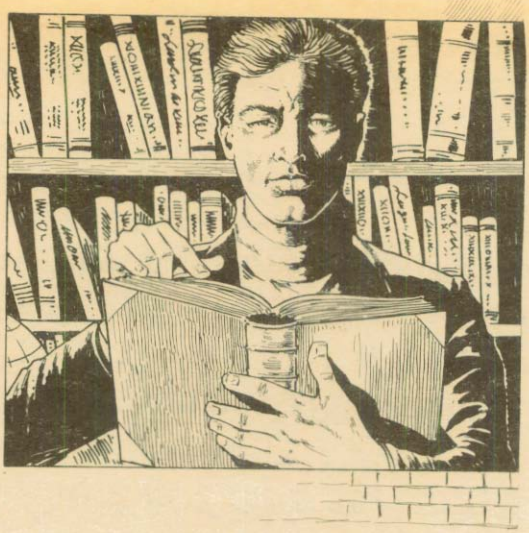

ایک ڈاکو جو ادیب بن گیا

محمد سلمان صدیق احمد خان

ستر برس سے بھی پہلے کا ذکر ہے کہ ایک خستہ حال اور آوارہ نوجوان ایک مال گاڑی سے لٹک کر بفلو شہر میں داخل ہوا اور پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے گھر گھر روٹی مانگنے لگا۔ ایک سپاہی نے سے آوارہ گردی کے الزام میں پکڑ لیا۔ جب اسے مجسٹریٹ کے سامنے لایا گیا تو اسے ایک ماہ قید بامشقت ہوئی۔ تیس روز تک وہ جیل کی سوکھی روٹیاں کھاتا اور پتھر توڑتا رہا۔

لیکن.....!

لیکن صرف چھ برس بعد وہی خستہ حال بھیک مانگنے والا نوجوان مغربی امریکہ کا اہم ترین شخص بن گیا۔ کیلی فورنیا کے معزز گھرانے اسے اپنے یہاں مدعو کرتے۔ ادیب، نقاد اور ایڈیٹر اسے ادبی دنیا کے افق کا روشن ترین ستارہ سمجھتے تھے۔ انیس برس کی عمر سے پہلے وہ کبھی ہائی اسکول نہ گیا تھا۔ وہ چالیس برس کی عمر میں فوت ہوا۔ اور اپنے پیچھے ۵۱ کتابیں چھوڑ گیا۔

وہ جیک لندن تھا۔

جب جیک لندن نے ۱۹۰۳ء میں "جنگل کی پکار" لکھی تو وہ ایک رات کے اندر اندر مشہور ہو گیا۔ ایڈیٹر کہانیوں کے لئے اس کے پیچھے بھاگنے لگے۔ لیکن اسے اپنی پہلی مشہور کتاب کا بہت کم معاوضہ ملا۔ ناشروں اور بعد میں ہالی وڈ کے فلم سازوں نے اس کی کتاب سے دو لاکھ پونڈ کمائے۔ لیکن اس نے "جنگل کی پکار" کے جملہ حقوق فقط چار سو پونڈ میں فروخت کئے تھے۔

جیک لندن جہازراں، ڈاکو اور کان کن رہ چکا تھا۔ اس نے آدھی دنیا کے گرد چکر لگایا تھا۔ ایک خستہ حال جوان کی حیثیت سے اس نے اپنے بارے میں کتاب لکھی۔ وہ اکثر بھوکا رہتا۔ وہ پارکوں میں پڑے بینچوں، گھاس کے گٹھوں اور مال گاڑی کے ڈبوں میں سوتا۔ بعض دفعہ ایسا بھی ہوا کہ جب وہ جاگا تو خود کو پانی کے جوہڑ میں پایا۔ بعض دفعہ وہ اتنا تھکا ہوتا کہ مال گاڑی کی سلاخ سے لٹکا سو جاتا۔ اس نے سینکڑوں بار قید خانے کی ہوا کھائی۔ وہ میکسیکو، جاپان، کوریا اور منچوریا میں بھی قید رہا۔

جیک لندن کا بچپن افلاس اور سختیوں میں گھرا ہوا تھا۔ وہ قذاقوں کے ایسے گروہ کا رکن رہا تھا جو خلیج سان فرانسکو کے لمبے ساحلوں پر جہاز لوٹا کرتے تھے۔ اسکول جانے کے نام پر وہ قہقہہ لگاتا اور زیادہ تر جوا کھیلتا۔ ایک دن وہ ایک پبلک لائبریری میں گیا۔ روبن سن کروسو پڑھنے لگا۔ اس کتاب نے اسے بہت متاثر کیا۔ دوسرے دن وہ کوئی اور کتاب پڑھنے کے لئے بھاگا ہوا لائبریری گیا۔ اب اس پر کتابوں کے مطالعے کی ناقابل تسکین پیاس مسلط ہو گئی۔ اکثر وہ ایک دن میں پندرہ گھنٹے مطالعہ کرتا۔ نک کارٹر سے شیکسپیئر تک اور ہربرٹ اسپینسر سے کارل مارکس تک ہر کتاب پڑھی۔ انیس برس کی عمر میں وہ اوک لینڈ (کیلی فورنیا) میں ایک ہائی سکول میں داخل ہو گیا۔ وہ دن رات پڑھتا نیند کی بھی پرواہ نہ کرتا۔ اس لئے چار سال کا نصاب تین ماہ میں ختم کر دیا اور امتحان پاس کر کے کیلی فورنیا یونیورسٹی میں داخل ہو گیا۔ وہ ایک آتشیں جذبے کے تحت لکھنے میں محو ہو گیا۔ وہ ہر روز پانچ ہزار الفاظ لکھتا۔ گویا بیس دن میں ایک ناول۔ مختلف ایڈیٹروں کے پاس اس کی تیس کہانیاں ہوتیں مگر وہ سبھی واپس آجاتیں۔ ابھی تو وہ کام سیکھ رہا تھا۔

وہ ۱۸۹۶ء کا سال تھا۔ ایک ولولہ انگیز سال، کلن ڈائک میں سونا دریافت ہوا۔ امریکی قوم پاگل ہو گئی۔ دکانداروں نے دکانیں، فوجیوں نے فوج، تاجروں غرضیکہ ہر ایک نے کاروبار چھوڑا اور سونے کے لئے دوڑا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہاں انسانوں کا منڈی دل تھا۔ جیک لندن بھی ان میں تھا۔ وہ ایک برس سونا حاصل کرنے کی جدوجہد میں رہا۔ اس میں اس نے ناقابل یقین سختی سہی۔ وہ سردیوں میں یخ زمین پر سوتا۔ آخر وہ واپس امریکہ آیا۔ اس نے ہوٹلوں میں برتن بھی دھوئے، جھاڑو بھی دیا، جہازوں اور کارخانوں میں کام کیا۔ پھر ایک دن جب اس کا تمام اثاثہ دس شلنگ تھا اس نے جسمانی محنت ترک کی اور تمام وقت ادب کے

لئے وقف کر دیا۔ ۱۸۹۸ء سے ۱۹۰۳ء تک وہ چھ کتابیں اور ایک سو پچیس کہانیاں شائع کرا چکا تھا۔ سب سے زیادہ ادب میں اس کا چرچا تھا۔ جیک لندن ۱۹۱۶ء میں وفات پا گیا۔ ادبی زندگی کے آغاز کے صرف اٹھارہ برس بعد اس زمانے میں اس نے تین ناول فی سال لکھے۔ اس کی سالانہ آمدنی امریکی صدر کی سالانہ آمدنی کے برابر تھی، بلکہ دوگنا۔ آج بھی یورپ میں اس کی کتابیں بہت مقبول ہیں۔ اس کا شمار ان امریکی ادیبوں میں ہے جن کی کتب دنیا بھر میں پڑھی جاتی ہیں۔" جنگل کی پکار" جس کا معاوضہ صرف چار سو پونڈ ملا تھا بہت سی زبانوں میں ترجمہ ہوئی ہے۔ اس کی پندرہ لاکھ سے زائد جلدیں فروخت ہوئی ہیں اور وہ امریکی ادب کی مقبول ترین کتاب ہے۔

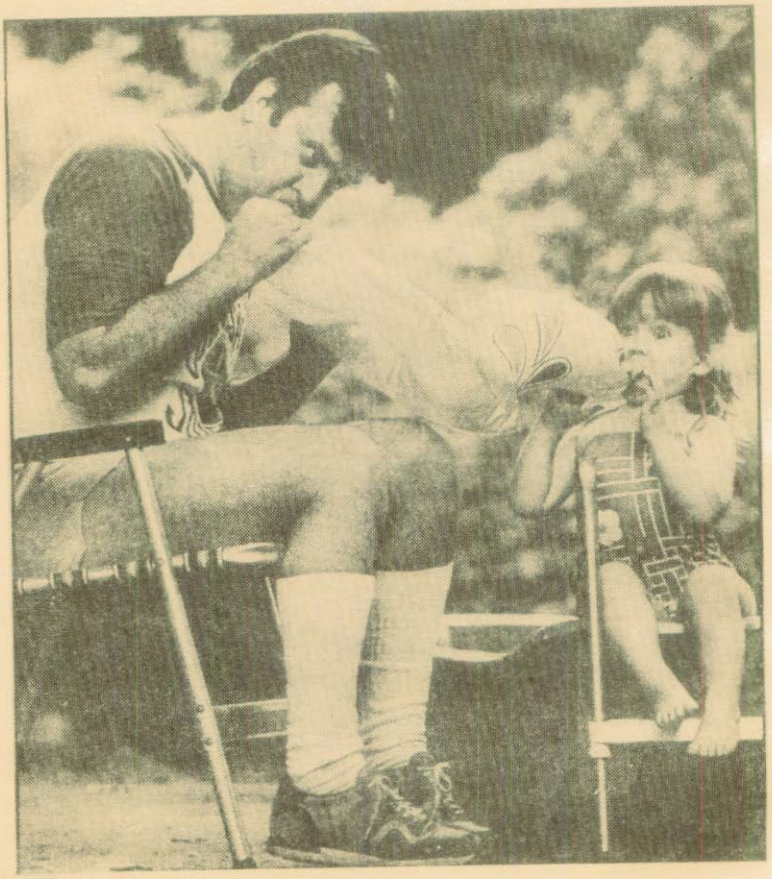

ایک پرانی کہانی

فیروز خرم

ایک کوّا بڑا سیانا تھا
وہ پرندوں میں سب سے دانا تھا

پیاس سے ایک دن بڑا بے تاب
ڈھونڈتا تھا کوئی کنواں، تالاب

بڑھ رہی تھی بہت پریشانی
اس کو ملتا نہ تھا کہیں پانی

دور و نزدیک اُڑتا پھرتا تھا
اپنی بے چارگی پہ کڑھتا تھا

صبح سے شام ہوگئی لیکن
ہاتھ آیا نہ کچھ گیا اِک دن

آئی ایسے میں جب خدا کی یاد
رازقِ کُل جہاں سے کی فریاد

نقشِ اُمید پھر اُبھر آیا
دور سے اِک گھڑا نظر آیا

اُڑ کے پہنچا تو بس لبِ دَم تھا
پانی موجود تھا مگر کم تھا

ایک تدبیر ذہن میں آئی
عقل نے راہ اس کو دکھلائی

چونچ میں لے کے آیا بھر بھر کر
جس جگہ بھی ملے اسے کنکر

ڈالے کنکر گھڑے کے اندر جب
پانی نیچے سے آیا اوپر تب

پیاس اپنی بجھائی کوّے نے!
کیسی تیزی دکھائی کوّے نے!
(ماخوذ)

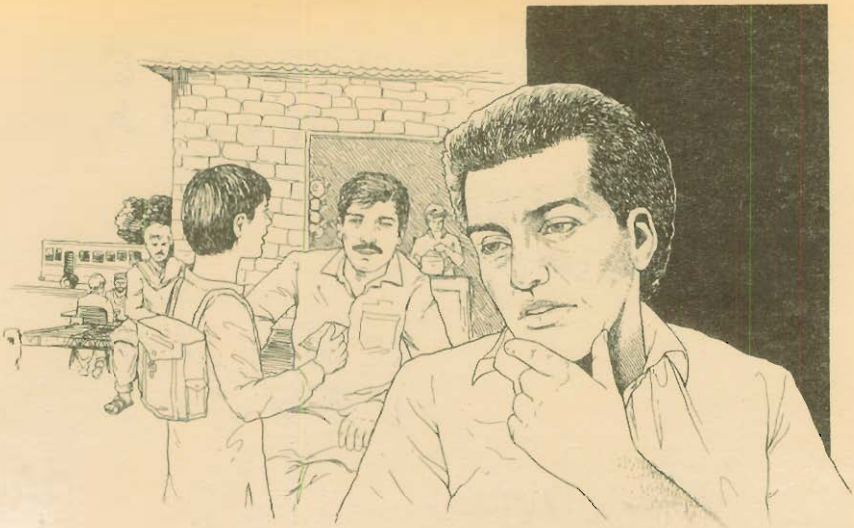

چھوٹی سی بات

عطا حسین ملک

"ٹکٹ ٹکٹ" کی آوازیں لگاتا ہوا کنڈیکٹر جب رمضان کے پاس آیا تو اس نے اپنی نگاہیں کھڑکی سے باہر سڑک کے کنارے ایک ٹھیلے والے پر گاڑ دیں اور یوں بن گیا جیسے اس نے کنڈیکٹر کی آواز سنی ہی نہ ہو۔ کنڈیکٹر کا ہاتھ کچھ دیر اس کے سامنے پھیلا رہا اور پھر وہ یہ خیال کر کے آگے بڑھ گیا کہ شاید ان صاحب کا ٹکٹ ہو چکا ہے۔

رمضان نے مسکرا کر اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے شخص پر نظر ڈالی اور دل میں سوچنے لگا کہ واہ میری اداکاری کا جواب نہیں۔ کیسی شاندار اداکاری کرتا ہوں۔ کنڈیکٹر سوچ بھی نہیں سکتا کہ میرا ٹکٹ نہیں ہوا۔

وہ ایک گارمنٹ فیکٹری میں ملازم تھا اور سلائی کا کام کرتا تھا۔ اس کی آمدنی اتنی تھی کہ اس کا اور اس کے بچوں کا گزر بسر اچھی طرح ہو سکتا تھا۔ لیکن اسے ہاتھ کی صفائی دکھانے کا بہت شوق تھا۔ اکثر

دکان سے سامان خریدتے ہوئے وہ کوئی چھوٹی موٹی چیز اٹھا کر اپنی جیب میں ڈال لیتا، کسی ہوٹل پر کھانا کھاتا اور پھر پیسے دیئے بغیر باہر نکل آتا اور کبھی بن کباب کے ٹھیلے پر کھڑا ہوتا تو جتنی دیر میں کباب والا اس کے لئے بن کباب تیار کرتا وہ اس کی آنکھ بچا کر ایک آدھ کباب جیب میں منتقل کر چکا ہوتا۔ ایک بار تو اس نے خشک میوہ کے ٹھیلے پر سے خان صاحب کو چکما دے کر پستوں سے بھری ہوئی دو ڈھائی کلو کی تھیلی غائب کر دی تھی۔ یہ سارے کام وہ اپنی فطرت سے مجبور ہو کر کرتا تھا۔ ایسے کام کر کے اس کے دل کو بڑا سکون ملتا اور پھر اس کے کچھ دوست ہوتے جو اس کی اڑائی ہوئی چیزوں میں حصہ بٹاتے اور اس کی جھوٹی تعریف کرتے جاتے جس سے رمضان کو اور حوصلہ ملتا اور وہ اپنی تعریف سن کر مزید پھول جاتا۔

دفعتاً رمضان کی نظر اپنے بیٹے عمران پر پڑی جو اسکول کا بیگ لٹکائے اگلی سیٹ پر بیٹھا تھا اور کنڈیکٹر کو آواز دے کر اپنی جانب متوجہ کر رہا تھا لیکن کنڈیکٹر کو شاید عمران کی آواز سنائی نہ دی، اس لئے وہ اسے نظر انداز کر کے خواتین کے حصے میں پہنچ گیا۔ اتنی دیر میں بس کا آخری اسٹاپ آگیا۔ رمضان کا گھر آخری اسٹاپ کے قریب ہی تھا۔ سب لوگ ایک ایک کر کے بس سے اُترنے لگے۔

کنڈیکٹر بھی بس سے اتر کر قریب کے ہوٹل میں داخل ہو گیا۔ رمضان آواز دے کر اپنے بیٹے کو مخاطب کرنا چاہتا تھا لیکن پھر وہ کچھ سوچ کر خاموش ہو گیا۔

عمران بھی کنڈیکٹر کے پیچھے تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا ہوٹل میں داخل ہو گیا اور ہاتھ میں پکڑے ہوئے پیسے اسے دیتے ہوئے کہا،

"یہ لو مجھے ٹکٹ دو، تم بس میں میرا ٹکٹ لینا بھول گئے تھے۔"

کنڈیکٹر نے تعریفی نظروں سے عمران کو دیکھتے ہوئے اس سے پیسے لے لئے پھر اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر ٹکٹ اسے دے دیا۔

رمضان دور کھڑا یہ سب کچھ دیکھتا رہا۔ عمران جب ہوٹل سے باہر نکلا تو اس کی نظر اپنے ابّو پر پڑی۔ وہ تیز تیز قدموں سے رمضان کے پاس پہنچ گیا۔ رمضان نے بیٹے سے پوچھا کہ کنڈیکٹر کیا کہہ رہا تھا۔

"کنڈیکٹر میری تعریف کرتے ہوئے کہہ رہا تھا کہ بیٹا تم کسی نیک اور شریف باپ کی اولاد معلوم ہوتے ہو جبھی اتنے ایماندار ہو۔" عمران نے جواب دیا۔ رمضان کو یوں معلوم ہوا جیسے کسی نے اس کے منہ پر پوری طاقت سے طمانچہ مارا ہو اس نے ندامت سے نظریں جھکالیں۔

علم و ادب کے فروغ میں جو ادارے "آنکھ مچولی" سے تعاون کر رہے ہیں۔ ان کی تعداد بے شمار ہے۔ اس صفحے پر ہم صرف اُن بڑے ایجنٹس کی فہرست دے رہے ہیں، جن کی کوششوں سے ماہنامہ آنکھ مچولی پاکستان کے دُور دراز علاقوں تک بڑی تعداد میں پہنچتا ہے۔

آنکھ مچولی کے ایجنٹس

پاکستان بھر میں

محمد حسین برادرز۔ کراچی فون:۔ ۷۲۳۹۵۵	پاکستان اسٹینڈرڈ بک اسٹال۔ سرگودھا فون:۔ ۶۲۹۵۱
سلطان نیوز ایجنسی۔ لاہور فون:۔ ۵۸۲۴۹	کیپٹل نیوز ایجنسی۔ بہاولپور فون:۔ ۲۹۵۷
ملک تاج محمد صاحب۔ راولپنڈی فون:۔ ۵۵۴۳۲۱ / ۸۴۷۹۸۶	طاہر نیوز ایجنسی۔ جہلم فون:۔ ۰۵۹۴۱
مہران نیوز ایجنسی۔ حیدر آباد فون:۔ ۲۰۱۲۸	چوہدری امانت علی اینڈ سنز۔ رحیم یار خان فون:۔ ۲۶۲۶
افضل نیوز ایجنسی، چوک یادگار، پشاور فون:۔ ۶۲۵۱۵ / ۶۲۷۵۱	سلمان برادرز۔ نواب شاہ فون:۔ ۲۴۱۴
اے ایس حامد نیوز پیپر سروس، ملتان فون:۔ ۴۳۳۱۰ / ۴۱۷۵۷	اسلم نیوز ایجنسی۔ اخبار گھر۔ گوجرانوالہ
فیاض بک ڈپو۔ فیصل آباد فون:۔ ۲۷۴۰۶	اشرف نیوز ایجنسی۔ بالمقابل جی ٹی ایس بس اسٹینڈ۔ اوکاڑہ
سعید بک اسٹال۔ گجرات فون:۔ ۰۴۳۳۱	مسلم بک ڈپو۔ سرائے عالمگیر

یونائیٹڈ بک لینڈ سکھر فون: ۸۵۷۲۸

رسالہ نہ پہنچنے کی صورت میں یا بروقت نہ ملنے پر مندرجہ ذیل پتے پر خط لکھئے

سرکولیشن مینیجر

"ماہنامہ آنکھ مچولی" ڈی ۱۱۲، نورس روڈ، سائٹ کراچی ۱۶

نئے لکھنے والوں کی مختصر تحریروں کا مستقل سلسلہ

لکھنے سے پہلے پڑھنے کی باتیں

آپ اگر واقعی کم سن ہیں تو مختصر تحریروں کا یہ سلسلہ آپ ہی کے لئے ہے۔ یاد رہے کہ صاف، خوشخط اور مختصر ترین تحریریں جلد شائع ہوسکیں گی۔ جس تحریر کی پشت پر قلم کار کا نام پتا درج نہ ہوگا اُسے مایوسی ہوگی۔ نقل شدہ تحریروں کی سزا "بلیک بکس" برقرار رہے گا۔ کم سن قلم کار چاہیں تو اپنی تحریروں کے ساتھ اپنی تصاویر بھی بھجوا سکتے ہیں۔ تصویر اچھی ہوئی تو ضرور شائع ہوگی۔ قلم کار ساتھی آنکھ مچولی میں شائع ہونے والا نوٹس بورڈ وقتاً فوقتاً ضرور پڑھتے رہا کریں۔ کم سن قلم کار میں شائع ہونے والی تحریروں کو آنکھ مچولی کی اعزازی کاپی روانہ کی جائے گی۔

(ادارہ)

مناجات

مرسلہ ..... انوار احمد

تیرا کرم خدایا
انساں مجھے بنایا
کیا تھا وجود میرا
ہستی میں مجھ کو لایا
مٹی سے مجھ کو پہلے
اک آدمی بنایا
امت میں آپ ؐ کی پھر
تو نے مجھے اٹھایا
اتنا کرم بھی کر دے
انساں جو ہے بنایا
ایمان پر ہی رکھنا
مجھ کو میرے خدایا
ایمان پر اٹھانا
جب حشر ہو خدایا

"ملاّ نصیرالدین کے قصے"

مرسلہ :۔ ایم اکمل شاکر

ترکی کا مشہور شہراق کے قریب ایک گاؤں تھا۔ ملا نصیرالدین اسی گاؤں میں رہا کرتے تھے۔ اگرچہ ملا کا انتقال ہوئے پانچ سو ستر سال بیت گئے مگر کسی نے سچ کہا ہے کہ بعض لوگ مرنے کے بعد بھی زندہ رہتے ہیں۔ ملا نصیرالدین آج بھی اپنی باتوں کے سبب ہمارے درمیان زندہ ہیں۔ ان سے منسوب چند واقعات میں آپکو سناتا ہوں۔

ایک دن ملا نصیرالدین کی بیٹی روتی پیٹتی اپنے سسرال سے آئی اور شکایت کرنے لگی۔ "آپ نے مجھے کسی بھاڑ میں جھونک دیا میں روزانہ کے جھگڑوں سے تنگ آگئی ہوں میرا شوہر بڑا ظالم ہے آئے دن مجھے مارتا ہے آج بھی اس نے مار پیٹ کر مجھے گھر سے نکال دیا ہے۔ ملا نے جو یہ سنا تو فوراً اپنے اور دو چار ہاتھ زور زور سے بیٹی کو دے مارے جب اس کام سے فارغ ہو گئے تو غصے میں لال پیلے ہوتے ہوئے بولے۔ "جا کر اپنے شوہر سے کہہ دے کہ ابھی میرا باپ زندہ ہے تو نے میری بیٹی کو مارا تو میں نے بھی تیری بیوی کی مرمت کر دی اور ہاں یہ بھی کہہ دینا کہ اگر آئندہ گھر سے نکالا تو میں کبھی بھی تیری بیوی کو گھر میں گھسنے نہیں دوں گا۔"

ملا نصیرالدین ایک دن اپنے دوستوں کے ساتھ سفر کر رہے تھے راستے میں کھانے کا وقت ہو گیا ملا نے کہا "آؤ پہلے کھانا کھالیں پھر آگے چلیں گے" دوست تیار ہو گئے۔ سب نے اپنا اپنا کھانا کھولا ملا نے دوستوں کا

کھانا دیکھا تو انہیں بڑی مایوسی ہوئی وہ لوگ صرف ایک ایک روٹی لے کر چلے تھے ساتھ میں کوئی سبزی بھی نہیں تھی جبکہ ملا انڈے پراٹھے بنا کر لائے تھے۔ دوستوں نے ملا سے کہا آؤ ہم سب ساتھ بیٹھ کر کھائیں ایک ساتھ کھانے سے برکت ہوگی ملا نے جواب دیا "آپ لوگوں کا یہ فرمان بالکل بجا ہے کہ مل کر کھانے میں برکت ہوتی ہے لیکن اب جبکہ میں آپ کا کھانا دیکھ چکا ہوں مجھے یقین ہے کہ آپ کے کھانے میں تو برکت ہو گئی مگر میرے کھانے میں کمی ہو جائے گی۔"

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ ملا نصیرالدین کے ایک دوست نے انہیں شکار پر چلنے کی دعوت دی ملا فوراً تیار ہو گئے۔ دوست نے انہیں مریل گھوڑا اور دوسرے لوگوں کو اچھے اور تیز رفتار گھوڑے دیئے ان لوگوں نے جونہی جنگل میں قدم رکھا موسلہ دھار بارش شروع ہو گئی شکاری بہت پریشان ہوئے اور انہوں نے گھوڑوں کو واپس گھر کی طرف بھگانا شروع کر دیا بارش اتنی تیز تھی کہ وہ سب چند لمحوں میں بھیگ کر شرابور ہو گئے جب گھر پہنچے تو ہر شکاری کے کپڑوں سے

پانی ٹپک رہا تھا۔

اب ملا کی روداد سنئے۔ ان کا گھوڑا تو تھا ہی مریل، بارش شروع ہوئی تو اس کی رفتار مزید سست ہو گئی ملا نے چاروں طرف دیکھا، دوسرے بھی بہت آگے نکل چکے تھے انہوں نے اپنے تمام کپڑے اتار لئے انہیں لپیٹ کر گھوڑے کی پیٹھ پر رکھا اور گھوڑے پر سوار ہو گئے اس طرح خود تو بھیگتے رہے۔ لیکن کپڑے بارش سے محفوظ رہے۔ جب گھر نزدیک آیا تو انہوں نے کپڑے پہن لئے اس وقت تک بارش تھم چکی تھی وہ جب اپنے ساتھیوں سے ملے تو وہ ملا کے کپڑے خشک دیکھ کر بڑے حیران ہوئے ملا بولے۔ "میرے خشک رہنے کی وجہ آپ کا دیا ہوا گھوڑا ہے۔"

دوسرے دن صبح یہ لوگ پھر شکار کیلئے روانہ ہوئے اس مرتبہ ان کے دوست کے پاس مریل گھوڑا تھا اور تیز رفتار گھوڑا ملا کے پاس تھا۔ ان کے دوست نے سوچا شاید اس گھوڑے کی بدولت ملا کے کپڑے خشک رہے۔ اتفاق کی بات ہے اس دن پھر بارش ہو گئی۔ شکاریوں کی جماعت پانی میں شرابور واپس آئی ادھر ملا پھر خشک آموجود ہوئے انہوں نے آج پھر پہلے والی ترکیب پر عمل کیا تھا اب تو ان کے دوست کو ان پر بڑا غصہ آیا اس نے چلا کر کہا: "یہ سراسر تمہاری زیادتی ہے ملا! تم نے مریل گھوڑا دے کر میرے بھیگنے کا سامان کر دیا۔"

دوست کی بات سن کر وہ بولے:

"آپ مجھ پر ناحق شبہ کر رہے ہیں لیکن یہ سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے کہ خود کو خشک رکھنے کے لئے اپنی عقل سے بھی کام لینا پڑتا ہے۔"

نئے سال کی پکار

عطا حسین..... اورنگی کراچی

سن لو لگا کے کان نئے سال کی پکار
بچے ہو یا جوان نئے سال کی پکار
دنیا میں اپنے ملک کا چمکاؤ ایسے نام
سارا جہاں وطن کو تمہارے کرے سلام
ماں باپ اور بزرگوں کا اتنا کرو ادب
مل کر کریں دعائیں تمہارے لئے وہ سب
محنت کرو جہاں میں کہ محنت ہے اچھی بات
ہوتی ہیں حل جہاں میں اس سے ہی مشکلات
کھیلوں کا وقت ایک مقرر ہو سارا سال
قائد کی سامنے ہے تمہارے لئے مثال
بہہ جاؤ تم کہیں نہ تعصب کی لہر میں
مل کر دیئے جلاؤ محبت کے شہر میں

کمپیوٹر

ترجمہ ..... محمد خالد مغل

ہم سائنس اور ٹیکنالوجی کے دور میں رہ رہے ہیں۔ بہت ساری حیران کن ایجادات کو دیکھتے ہیں۔ روز بروز ان کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ ان ایجادات سے ہماری زندگی میں آسانی، آرام، اور دلچسپی ہو گئی ہے۔ جدید اور حیران کن ایجادات میں سے ایک کمپیوٹر ہے۔ یہ ایک خود کار بجلی کی مشین ہے۔ یہ شماریات کے لئے بہت مفید مشین ہے۔ اس سے حسابی مشکلات حل ہوتی ہیں۔ کمپیوٹر کا استعمال آج کل عام ہے ..... یہ بینک، صنعتوں، ہسپتالوں اور امتحانی بورڈ میں استعمال ہوتے ہیں۔ وہ جدید زندگی کا حصہ بن چکے ہیں۔ وہ بغیر آرام کے کام کرتے ہیں اور غلطی نہیں کرتے۔

ان مشینوں کا مقصد انسانی محنت اور وقت کی بچت کرنا ہے، مثلاً یونیورسٹی کا پروفیسر قدیم عمارت کا زمانہ تعمیر معلوم کرنا چاہتا ہے، کمپیوٹر ایک ہی منٹ میں ساری کی ساری تفصیلات بتا دیتا ہے۔ عام حالات میں ان تفصیلات کو جاننے کے لئے کئی ایک سال لگ جاتے۔ کمپیوٹر دو قسم کے ہوتے ہیں۔ اینالاگ (نظیری) اور ڈیجیٹل (ہندسی) ۔ اینالاگ مفروضات پر کام کرتا ہے اور ڈیجیٹل ہندسوں سے کام کرتا ہے۔ ایک بڑا کمپیوٹر دو لاکھ پچاس ہزار کی جمع تفریق ایک سیکنڈ میں ایک لاکھ تک ضرب کے سوالات یا اس سے بھی زیادہ ساٹھ ہزار تک تقسیم کے سوالات حل کر سکتا ہے۔

ایک کمپیوٹر چار غیر ملکی زبانوں کا ترجمہ کر سکتا ہے، بعض اوقات کمپیوٹروں کو "بجلی کے دماغ" بھی کہا جاتا ہے۔ لیکن وہ صرف آلات ہیں اور صرف طے شدہ اصولوں کے مطابق کام کرتے ہیں۔

دلچسپ و عجیب معلومات

مرسلہ ..... جہاں زیب مغل ۔ کوئٹہ

۱۔ افریقہ کا وہ کونسا شہر ہے جس کے تمام مکانات نمک سے بنے ہیں؟

۲۔ کیلے فورنیا کے اس شکاری کا نام بتایئے جس نے اپنی زندگی میں ۳۵۰ شیر ہلاک کئے تھے؟

۳۔ روم کے اس بادشاہ کا نام بتایئے جس نے ۱۰۳۱ جنگیں لڑیں اور سب میں فتح حاصل کی؟

۴۔ ناروے کے کس بادشاہ نے اپنے پالتو کتے کو ایک ریاست کا وزیر اعلیٰ مقرر کیا تھا؟

۵۔ اپنی زبان کو برش کے طور پر استعمال کرنے والے مصور ہرانان کا تعلق کس ملک سے تھا؟

۶۔ دنیا کی سب سے بڑی گاجر کہاں پیدا ہوئی اور اس کی لمبائی کیا تھی؟

۷۔ کس ملک میں ننگے پاؤں چلنے والوں کو سزا دی جاتی ہے؟

۸۔ کس اسلامی ملک کی پولیس صرف چار افراد پر مشتمل ہے؟

۹۔ دنیا کی سب سے چھوٹی کتاب کی لمبائی بتایئے؟

۱۰۔ دنیا کا سب سے مختصر نام سویڈن کے ایک شہر کا ہے۔ کیا آپ اس شہر کا نام بتا سکتے ہیں؟

جوابات

(۱)۔ ٹیہ ہم زا۔ (۲)۔ جے بروس۔ (۳)۔

کموڈس۔ (۴)۔ اسپین۔ (۵)۔ چین۔ (۶)۔ کیلے فورنیا، ساڑھے تین فٹ۔ (۷)۔ بلجیئم۔ (۸)۔ جبوتی۔ (۹)۔ ۲/۱۰ ملی میٹر۔ (۱۰)۔ اے۔

قومی پرچم

مرسلہ۔ اکبر خان۔ کراچی

○ ..... دنیا کا قدیم ترین پرچم ڈنمارک کا ہے۔

○ ..... نیپال کا پرچم دنیا کا وہ واحد پرچم ہے جو چوکور نہیں ہے۔

○ ..... متحدہ عرب امارات کا پرچم رنگ کے لحاظ سے سرخ، سفید، سبز اور کالا ہے۔

○ ..... یوگنڈا کے پرچم پر مرغ کی تصویر ہے۔

○ ..... بھوٹان کے پرچم پر اژدہے کی تصویر ہے۔

○ ..... ترکی دنیا کا واحد ملک ہے جس کے پرچم میں اب تک سب سے زیادہ تبدیلی ہوئی ہے۔

○ ..... برطانیہ کے پرچم کو یونین جیک کہتے ہیں۔

○ ..... اقوام متحدہ کے پرچم کو فور فریڈم فلیگ کہتے ہیں۔

○ ..... میکسیکو کے پرچم پر سانپ اور عقاب بنا ہوا ہے۔

○ ..... افغانستان کے پرچم پر مسجد بنی ہوئی ہے۔

○ ..... اقوام متحدہ کے پرچم پر دنیا کا نقشہ بنا ہوا ہے۔

○ ..... فلپائن کا پرچم جنگ کے دنوں میں اُلٹا لٹکایا جاتا ہے۔

○ ..... لاؤس کے پرچم پر تین ہاتھی بنے ہوئے ہیں۔

○ ..... آسٹریلیا کے پرچم پر چھ ستارے بنے ہوئے ہیں۔

ظہیر عباس شاہ ..... اٹک

کسی گاؤں میں حفیظ نامی ایک غریب شخص رہتا تھا۔ غریب ہونے کے باوجود پورے گاؤں میں اسکی ایمانداری اور امانت داری کا چرچہ تھا۔ گاؤں کے لوگ اپنی چیزیں امانت کے طور پر اس کے پاس رکھتے تھے۔ حفیظ دل ہی دل میں بہت خوش تھا کہ جب کبھی بڑی رقم ہاتھ میں آئے گی تو وہ گاؤں سے نکل جائے گا۔ اس کی تین جوان بیٹیاں بھی تھیں۔ اس کے پاس اتنی رقم نہ تھی کہ ان تینوں کی شادی کر سکے۔ دوسرے گاؤں کے سردار نے جب اس کی ایمانداری کی خبر سنی تو اس نے کسی مجبوری کے تحت اپنی رقم اس کے پاس امانت کے طور پر رکھ

دی۔ سردار کو اس پر اعتماد تھا۔ لیکن حفیظ دولت کو دیکھ کر لالچی ہوگیا۔ پہلے بھی اس کے دل میں کھوٹ تھا۔ لیکن دولت کی ہوس نے اور بھی بے ایمان بنادیا۔ اس نے سوچا کہ کسی طریقے سے گاؤں والوں کو خبر نہ ہونے پائے اور وہ وہاں سے نکل جائے چنانچہ وہ رات کے سناٹے میں بھاگ گیا۔

دو تین ماہ کے بعد جب سردار کو رقم کی ضرورت محسوس ہوئی تو وہ رقم واپس لینے کے لئے آیا لوگوں سے پوچھنے پر پتہ چلا کہ وہ گاؤں سے رات کے سناٹے میں پتہ نہیں کہاں چلا گیا۔ سردار نے اس وقت تو حفیظ کے بارے میں لوگوں سے کچھ نہ کہا لیکن بعد میں اس نے چند آدمیوں کو اکٹھا کر کے کہاں جو " آدمی بھی حفیظ کو ڈھونڈ کر لائے گا وہ انعام کا مستحق قرار پائے گا۔ " کچھ آدمی حفیظ کی تلاش میں گاؤں سے نکلے چند دنوں کی کوشش کے بعد انہیں حفیظ کا سراغ مل گیا وہ ایک گاؤں میں اپنے دوست کے گھر چھپا ہوا تھا اطلاع ملنے پر اس کے گاؤں کے کئی لوگ اس کے تعاقب میں وہاں پہنچے اور بڑی کوشش کے بعد اسے پکڑ کر گاؤں کے سردار کے پاس لے گئے جس کی بڑی رقم لے کر حفیظ بھاگا تھا۔

سردار نے حفیظ کے گاؤں کے سردار سے مل کر حفیظ کے لئے ایک انوکھی سزا تجویز کی...اور وہ سزا یہ تھی کہ حفیظ اپنی زندگی میں گاؤں سے باہر کہیں نہیں جائے گا۔ اور گاؤں کا کوئی شخص چار برس تک حفیظ سے بات بھی نہیں کرے گا۔ حتیٰ کے اس کی بیٹیاں اور بیوی بھی نہیں۔

سزا کے اعلان کے بعد سردار نے حفیظ سے کہا۔

"ہم تمہیں اتنی سخت سزا اس لئے دے رہے ہیں کہ تم نے لوگوں کے اعتماد کو ٹھیس لگائی ہے۔ تم بے ایمان آدمی سے بھی زیادہ برے ہو کیوں کہ بے ایمان آدمی کو سب جانتے ہیں کہ یہ بے ایمان ہے اس لئے وہ اس سے ہوشیار رہتے ہیں مگر لوگوں نے تمہارا یقین کیا۔ اور تم نے ان کا یقین توڑ دیا۔ تمہاری اس مثال سے نہ جانے کتنے ایمان دار لوگ دوسروں کی نظروں میں مشکوک ہو جائیں گے۔"

سردار کی باتیں سن کر حفیظ کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں اور وہ بولا۔ " آپ ٹھیک کہتے ہیں آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ " وہ کئی منٹوں تک یہی جملہ دہراتا رہا۔

کیا آپ جانتے ہیں ؟

۱۔ شاہراہ قراقرم کا دوسرا نام شاہراہ ریشم ہے۔
۲۔ زمانہ قدیم میں پشاور کو پرش پور کہا جاتا تھا۔
۳۔ حنا جھیل کوئٹہ میں واقع ہے۔
۴۔ ملتان کا نام زمانہ قدیم میں ناگا شہر تھا۔
۵۔ اولیاء کرام کا شہر ملتان کو کہتے ہیں۔
۶۔ چوک یادگار پشاور شہر میں ہے۔
۷۔ مینار پاکستان کا اصل نام یادگار قرار داد پاکستان ہے۔

مرسلہ ..... عدیلہ تعظیم

ریڈیو

مراسلہ ..... محمد جمیل اشرف۔ گجرات

آج کل ریڈیو ہر گھر کی ضرورت ہے۔ دنیا بھر کی خبریں، تفریحی پروگرام، بچوں کے پروگرام، مختلف ملکوں کے حالات، منڈیوں کے بھاؤ غرض ہر چیز کے بارے میں تازہ ترین اطلاعات ریڈیو ہی ہم پہنچاتا ہے۔ ہم ہر روز ریڈیو پر تازہ خبریں، مزے دار اور دلچسپ گانے سنتے ہیں۔ اسے اگر جادو کا ڈبہ کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا۔

کیا کبھی آپ نے سوچا کہ یہ چھوٹا سا ریڈیو سیٹ جو دور دور سے آوازیں اور پیغام ہمیں پہنچاتا ہے کس نے ایجاد کیا اور کیسے ایجاد ہوا؟ آپ میں سے بہت سے بچوں نے اس پر غور کیا ہو گا اور بہت سے بچے تو ریڈیو کے بارے میں یہ بھی جانتے ہوں گے کہ ریڈیو کو بنانے والا سب سے پہلا شخص مارکونی تھا۔ مارکونی اٹلی کا رہنے والا تھا۔ یہ شخص بہت ذہین تھا۔ اسکول ہی کے زمانے میں اسے بجلی کے تجربے کرنے کا شوق پیدا ہو گیا۔ اس زمانے میں ایک سائنس دان نے یہ پتہ چلایا کہ ہوا میں بعض لہریں اتنی تیزی سے چلتی ہیں کہ وہ ایک سیکنڈ میں ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل کا سفر طے کرتی ہیں۔ مارکونی نے ان لہروں پر تجربے شروع کر دیئے۔ اس نے پہلا تجربہ ایک گھنٹی بجا کر کیا۔ اس کے بعد تجربوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ پھر جب اسے احساس ہوا کہ اسے اپنے ملک میں تجربوں سے خاص مدد نہیں مل رہی تو وہ لندن چلا گیا، وہاں اسے بے شمار کامیابیاں نصیب ہوئیں اور وہ بہت مشہور ہو گیا۔ اس کے بعد مارکونی اٹلی واپس آیا۔ وہاں اس نے ایک اسٹیشن قائم کیا جس نے پہلی جنگ عظیم میں خاص کردار ادا کیا۔ شروع شروع میں ریڈیو سے بہت تھوڑے فاصلے تک پیغام پہنچایا جا سکتا تھا مگر اس کے بعد یہ فاصلہ بڑھتا گیا اور آج دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک نہایت آسانی سے پیغام پہنچایا جا سکتا ہے۔ ریڈیو بغیر تاروں کے کام کرتا ہے۔ جس آدمی کی آواز ریڈیو کے ذریعے لوگوں تک پہنچانا مقصود ہو۔ اسے مائکروفون میں بولنے کو کہا جاتا ہے۔ پھر یہ آواز ٹرانسمیٹر میں جاتی ہے۔ یہاں سے یہ لہریں ایتھر میں مل جاتی ہیں۔ ریسیور ان لہروں کو ایتھر سے الگ کر کے الفاظ علیحدہ کر دیتا ہے اور ریڈیو سیٹ میں لگا ہوا اسپیکر بجلی کی مدد سے ان الفاظ کو سننے کے قابل بناتا ہے۔

ریڈیو آج کے دور کی بہت بڑی نعمت ہے اس سے گھر بیٹھے لوگوں کے نہ صرف ہزاروں کام سنورتے ہیں بلکہ لاکھوں مسئلے بھی حل ہو جاتے ہیں۔

بڑائی کی بات

تابندہ شان

سونیا، پورے اسکول میں نہ صرف پڑھنے لکھنے والی اچھی لڑکی سمجھی جاتی تھی بلکہ اپنی خوبصورت آواز کے

حوالے سے تو شہر بھر کے اسکولوں میں اس کے چرچے ہونے لگے تھے۔ سونیا نغموں کے جس مقابلے میں بھی شریک ہوتی اپنی سریلی اور جادو جگانے والی آواز کے باعث ہمیشہ اوّل آتی۔ یوں سونیا نے بہت ہی کم عرصے میں اپنے اسکول کے لئے اتنے ڈھیر سارے انعامات جیت لئے تھے کہ اسکول کی سبھی لڑکیاں اسے رشک بھری نظروں سے دیکھتیں اور اس سے دوستی کر کے خوش ہوتیں۔

پھر ہوا یہ کہ سونیا سے متاثر ہو کر اس کی دوست نادیہ نے بھی گانا شروع کر دیا۔ چند ہی روز میں نادیہ بھی اسکول کی اچھی سنگر سمجھی جانے لگی۔ مگر یہ بات سونیا کو اچھی نہ لگی سونیا اپنی دوست کی اچھی آواز پر خوش ہونے یا تعریف کرنے کے بجائے اس کی برائیاں کرنے لگی۔ جبکہ نادیہ کا رویہ ہمیشہ ہی اچھا رہا۔ کئی بار دوستوں نے بھی سونیا کو سمجھایا مگر اس کے رویئے میں ذرّہ برابر فرق نہ آیا۔

ایک روز جب اسکول میں مختلف کلاسوں کے درمیان قومی نغموں کا مقابلہ شروع ہونے والا تھا سونیا نے ہمیشہ کی طرح بڑا بول بولنا شروع کیا۔ "ہونہہ، نادیہ کیا کرے گی میرا مقابلہ، دیکھ لینا پہلا انعام مجھے ہی ملے گا۔" سیون اپ کی ٹھنڈی بوتل پیتے ہوئے سونیا نے اور بھی بہت سی ایسی باتیں کیں۔ شاید اسکی یہ باتیں اللہ کو پسند نہ آئیں۔ مقابلہ شروع ہوا۔ سب نے باری باری نغمے سنائے۔ ندا نے "جیوے جیوے پاکستان" گانا شروع کیا تو پورا ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ اس کے برعکس جب سونیا کا نمبر آیا تو خلاف توقع اس کے گلے سے ایک کے بجائے تین آوازیں نکلنے لگیں۔ شاید سیون اپ کی ٹھنڈی بوتل اپنا کام دکھا چکی تھی۔ سونیا کا گلا خراب ہو گیا تھا۔ اس کی عجیب و غریب آواز سن کر پورا ہال قہقہوں میں ڈوب گیا۔ نادیہ اوّل آئی اور سونیا کو کوئی انعام نہیں ملا۔

مگر پھر یکایک ایک عجیب بات ہوئی۔ نادیہ مائیک پر آئی اور آکر کہنے لگی۔ "میری دوستو، سونیا محض گلہ خراب ہونے کی وجہ سے انعام نہ پا سکی ورنہ سچ یہ ہے کہ سونیا آج بھی اچھا گاتی ہے۔ میں نے اسے سن کر سیکھا ہے....." پورا ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ ندامت کے آنسو سونیا کی آنکھوں سے بہہ نکلے۔

قریب اب آرہے ہیں امتحان

اکرم سیال

قریب آرہے ہیں امتحان آہستہ آہستہ
نکل جارہی ہے اپنی جاں آہستہ آہستہ
بھری برسات میں استاد نے مرغا بنایا ہے
میری حالت پہ رویا آسمان آہستہ آہستہ
اگر انڈے یونہی آتے رہے ہر ایک پرچے میں
تو تہہ ہو جائے گی اپنی شان آہستہ آہستہ
چرائے پھول کچھ فیقے نے کچھ اللہ رکھے نے
ہوا پھولوں سے خالی گلستان آہستہ آہستہ

ڈاک کی کہانی

صباحت فاروقی کراچی۔

آپ میں سے کون ہو گا جو پوسٹ مین یعنی ڈاکیہ سے واقف نہ ہو گا۔ یہ ڈاکیہ آپ کے عزیزوں اور دوستوں کے خط اور مبارکباد کے پیغامات آپ لوگوں تک پہنچاتا ہے۔ نہ صرف اپنے یہ ملک کے مختلف حصوں سے خطوط ڈاک کے ذریعہ آپ تک بہ آسانی پہنچتے ہیں بلکہ بیرونی ملکوں سے بھی ڈاک گھر بیٹھے آپ تک پہنچ جاتی ہے۔ حال ہی میں پاکستانی محکمہ ڈاک نے ارجنٹ میل سروس اور ایریکس سروس شروع کی ہے جسکی بدولت خطوط اب بہت جلد ایک مقام سے دوسرے مقام تک پہنچ جاتے ہیں۔

لیکن ایک وہ زمانہ بھی تھا جب کسی پیغام کے ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچنے میں ہفتے نہیں بلکہ مہینے لگ جاتے تھے۔ پرانے زمانہ میں بادشاہوں اور راجاؤں کے یہاں پیغامات پہنچانے کے لئے خصوصی ملازم رکھے جاتے تھے۔ قدیم ہندوستان کے راجاؤں چندر گپت موریہ اور اشوک کے باقاعدہ محکمہ ڈاک کے قیام کے لئے کوشش کی۔ بعد میں ہندوستان کے مغل شہنشاہ بابر نے محکمہ ڈاک کی کارکردگی کو بہتر ... بہتر بنانے کے لئے بہت سی اصلاحات کیں ۱۶۸۸ء میں اپنا پہلا ڈاک خانہ قائم کیا۔ اسکے بعد ہندوستان کے شہر بمبئ مدراس اور کلکتہ میں بھی ڈاک خانے قائم ہوئے۔ ہندوستان پر اپنی گرفت مضبوط کرنے کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی نے کلکتہ اور مدارس اور بمبئ و مدراس کے درمیان زمین کے راستہ ڈاک سروس شروع کی۔ اس وقت ایک جگہ سے دوسری جگہ ڈاک پہنچانے والے کو "ہرکارا" کہا جاتا

ڈاک ٹکٹ چھاپنے کا قدیم طریقہ

تھا۔ رفتہ رفتہ ڈاک کے انتظام میں بہتری ہوئی۔ ۱۸۵۷ء میں ڈاک ٹکٹوں کا رواج شروع ہوا۔

۱۸ فروری ۱۹۱۱ء کو برصغیر پاک وہند کے ڈاک کے نظام میں ایک انقلاب آیا اور پہلی مرتبہ ہوائی ڈاک کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اسکے بعد ۹ ستمبر ۱۹۱۱ء کو انگلینڈ میں ہوائی ڈاک کے نظام کو کامیابی حاصل ہوئی۔ بین الاقوامی سطح پر ہوائی ڈاک کا پہلا کامیاب تجربہ اٹلی کے برڈسٹ نامی مقام سے البانیہ کے ویلونا نامی مقام تک ڈاک کے پہنچنے کے ساتھی مکمل ہوا۔

اقوالِ زرّیں

مرسلہ۔ عبدالحمید

۱...... جدو جہد نہ کرنا محتاجی کا باعث ہے۔ (حکیم لقمان)

۲...... دانا اور حکیم آدمی وہ ہے جو کسی چیز پر غرور نہ

کرے۔ (فرید الدین داتا گنج بخش)

۳..... جو شخص دوسروں کے غم سے بے تعلق ہے وہ آدمی کہلانے کے قابل نہیں۔ (شیخ سعدی)

۴..... مومن کی نیت اس کے عمل سے بہتر ہے۔ (حضرت علیؓ)

دنیا کی حقیقت

مرسلہ۔ رفیع اللہ سوات

حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ حضورؐ نے مجھ سے فرمایا کہ "کیا میں تمہیں دنیا کی حقیقت نہ بتادوں ؟" میں نے عرض کیا کہ کیوں نہیں ضرور بتائیں۔ آپؐ مجھے مدینہ کے ایک قبرستان میں لے گئے، جہاں بنی آدم کی کھوپڑیاں، فضلات، پھٹے پرانے کپڑے اور ہڈیاں پڑی تھیں۔ حضورؐ نے فرمایا "ابو ہریرہؓ یہ بنی آدم کی کھوپڑیاں ہیں۔ یہ کھوپڑیاں دنیا کی اس طرح لالچ میں اور تمنا کرتی تھیں، جس طرح آجکل تم زندہ لوگ کرتے ہو۔ آج یہ بغیر گوشت پوست کے یہاں پڑی ہیں۔ اور چند دن بعد خاک میں تبدیل ہو جائیں گی۔ اور یہ فضلات وہ ذائقہ دار اور لذیذ خوراک ہیں۔ جنہیں ان لوگوں نے بڑی محنت سے کمایا پکایا اور کھایا تھا۔ یہ آج اس حالت میں پڑے ہیں کہ لوگ ان سے نفرت کرتے ہیں۔ یہ پھٹے پرانے کپڑے وہ خوبصورت ملبوسات ہیں۔ جنہیں پہننے پر لوگ غرور اور فخر کرتے تھے۔ اب ان کا یہ حال ہے کہ ہوائیں انہیں ادھر ادھر اڑاتی پھرتی ہیں۔ اور یہ ہڈیاں ان جانوروں کی ہیں۔ جن پر یہ سواری کرتے تھے۔ ان کے اس حال میں عبرتناک انجام پر جتنا رو سکتے ہو، رو۔" حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ ہم یہ سن کر بہت روئے۔

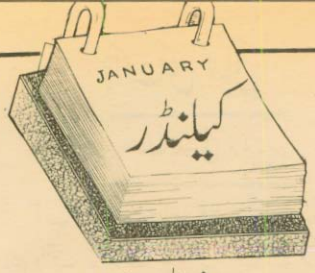

مبشر علی زیدی

سردی میں جاؤں گامری
جب ہوگا ماہ جنوری
دیکھو اگر تم جل پری
نعرہ لگاؤ فروری
جب بھی جلاؤ مارچ کو
تم یاد کر لو مارچ کو
کالے سے رنگ کا بیل ہے
اور ماہ بھی اپریل ہے
رو رو کے گڑیا سوگئی
تھا آنے والا جب مئی
آنکھوں میں سب کی خون ہے
شاید یہ ماہ جون ہے
ہوگی لڑائی بھائی سے
لگتے ہی بس جولائی کے
دشمن نے کھائی تھی شکست
یہ ماہ ہے ماہ اگست
جب چھت پر بندر آگیا
سمجھو ستمبر آگیا
جینا بھی تو دوبھر ہے اب
کیا ماہ اکتوبر ہے اب
سو میں سے نو نمبر ملے
یعنی نومبر آگئے
لو اب کلینڈر ختم ہے
یعنی دسمبر ختم ہے

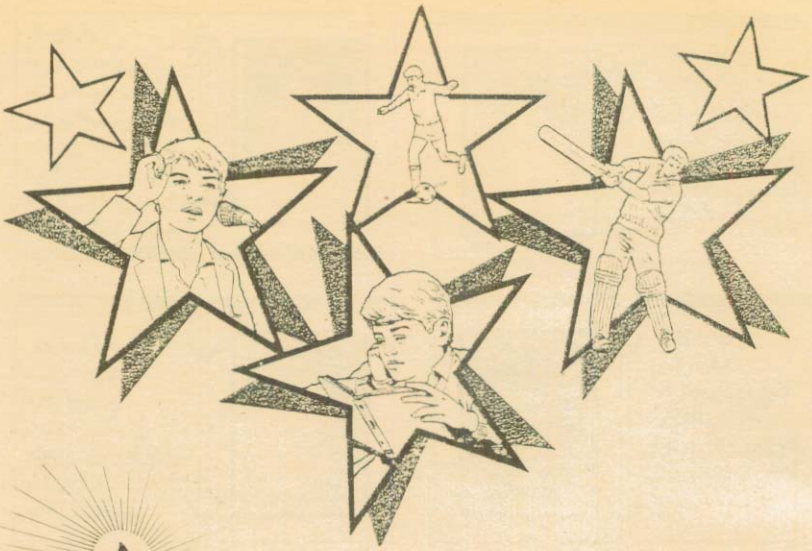

روشن مثال

The Pick of The month

ان ساتھیوں کا تعارف

جنہوں نے کسی بھی شعبے میں نمایاں کامیابی حاصل کی ہو

نیک نام محمد بیگ
۱۴ سال، گیارہویں۔
مشاغل۔ اسکاؤٹنگ ٹریکنگ۔
پسندیدہ مضمون۔ فزکس۔
کوئی اہم کامیابی۔ میٹرک اے ون گریڈ
پتہ: بی ایم بک سنٹر ۴۶۸
سرآغا خان روڈ گلگت۔

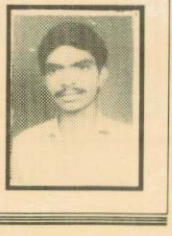

فاروق یعقوب۔
۱۹ سال جماعت۔ گیارہویں۔
مشاغل۔ وسائل اور معلوماتی کتابوں کا مطالعہ۔ پسندیدہ مضمون۔ سائنس۔
اہم کامیابی۔ میٹرک میں اے گریڈ ۴۱۳
خرفسا نوالہ مدینہ چوک۔ فیصل آباد۔

جمیل احمد
۱۸ سال، بارہویں۔
مشاغل، ادب و صحافت۔
پسندیدہ مضمون، اسلامیات۔
اہم کامیابی، مقابلہ مضمون نویسی میں
وزیر اعظم سے ڈیڑھ ہزار روپے انعام۔
مڑیاں شریف ڈاکخانہ ناروال۔
بائی پاس جی ٹی روڈ گجرات۔

بشیر احمد مغل۔
عمر نامعلوم، ہفتم۔
مشاغل، آنکھ مچولی پڑھنا۔
پسندیدہ مضمون نامعلوم۔
اہم کامیابی، ہفتم میں اوّل پوزیشن۔
بمقام و ڈاکخانہ بھکی شریف محلہ پکا
تالاب ضلع گجرات تحصیل پھالیہ۔

عنایت اللہ گھائل
۱۷ سال، سی کام۔
مشاغل، قلمی دوستی۔
پسندیدہ مضمون، انگریزی۔
اہم کامیابی، میٹرک میں اوّل پوزیشن۔
گورنمنٹ کمرشل کالج آف کامرس
کروڑ لعل عیسن ضلع لیہ۔

حکیم اللہ حیات
۱۴ سال، ہشتم۔
مشاغل، شاعری، رسائل پڑھنا۔
پسندیدہ مضمون، سائنس۔
اہم کامیابی، ہفتم میں دوسری پوزیشن
گورنمنٹ ہائی سکول دشت فوزیشن
ضلع تربت مکران بلوچستان۔

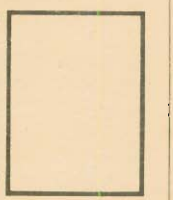

چوہدری محمد فیصل
۱۷ سال، گیارہویں۔
مشاغل، قلمی دوستی۔
پسندیدہ مضمون، انگلش۔
اہم کامیابی، میٹرک میں فرسٹ ڈویژن۔
چوہدری محمد فیصل ایوب منظور کالونی
ہوائی اڈہ روڈ خان پور ضلع رحیم یار خان

فرحت جبیں
۱۵ سال، دہم (ب)،
ادب، دینی کتب کا مطالعہ۔
انگریزی، حساب۔
کے جی سے نویں جماعت
تک اوّل یا دوئم۔
کراچی

عبدالواحد۔
۱۴ سال، نہم۔
مشاغل، قلمی دوستی، ورزش کرنا۔
پسندیدہ مضمون، بائیالوجی۔
اہم کامیابی، اوّل تا ہشتم اوّل
پوزیشن، گورنمنٹ ہائی سکول
نظر آباد ضلع تربت، بلوچستان۔

آپ کی تصویر اس فریم
کے سائز میں کٹی ہونی چاہئیے
چھوٹی یا بڑی تصویر
قابلِ قبول نہ ہوگی

کوپن کا صفحہ

آنکھ مچولی کے مختلف مقابلوں، یا تحریری سلسلوں میں شرکت کے لئے جابجا کوپن پھاڑنے سے رسالے کے بدنما ہونے کا اندیشہ رہتا ہے اسی لئے تمام کوپن اس صفحے پر یکجا کر دیئے گئے ہیں۔

آنکھ مچولی کی سالانہ خریداری کا کوپن

نام ---------- کلاس ---------- عمر ----------

ارسال کردہ کل رقم ---------- بذریعہ ---------- دستخط ----------

پتا ------------------------------

روشن مثال میں شرکت کا کوپن

نام ---------- عمر ---------- جماعت ----------

مشاغل ---------- پسندیدہ مضمون ----------

کوئی اہم کامیابی ------------------------------

پتہ ------------------------------

آئیے!

بڑوں کو سمجھائیں سگریٹ نہ سلگائیں

سگریٹ وہ غیر محسوس زہر ہے جو ہماری زندگی کو گھُن کی طرح چاٹ جاتا ہے اور بالآخر مُوذی امراض اور تکلیف دہ موت کے انجام سے دوچار کرتا ہے۔

سگریٹ نشہ ہے جو ہم سے ہماری فعال اور متحرک زندگی چھین کر ہمیں سُستی، کاہلی اور بے ہمتی کے روگ دیتا ہے۔

سگریٹ وہ لت ہے جو مضبوط اردوں اور آہنی عزائم کے قلعوں کو مسمار کر دیتا ہے۔

سگریٹ پینے والے کبھی شاہین صفت نہیں ہو سکتے سگریٹ کا دھواں نگلنے والے ہمیشہ صحت مند نہیں رہ سکتے۔

یاد رکھیے ہمارے اطراف جب کوئی سگریٹ پی رہا ہوتا ہے تو اُس کا دھواں اُسی کی رگوں میں اندھیرے نہیں بھرتا بلکہ ہماری سانسوں میں شامل ہو کر ہماری رگ و پے میں بھی اُترتا ہے۔ **تو پھر ـــــ ہم احتجاج کیوں نہ کریں** سگریٹ پینے والے اپنے بزرگوں کو کیوں نہ سمجھائیں کہ سگریٹ انہی کی نہیں ہماری بھی قاتل ہے۔ اچھے لہجے میں، شائستہ طریقے سے مہذب بچّوں کی طرح... آیئے اپنے بڑوں کے ہاتھ سے سگریٹ لے کر پھینک دیں اور ان کی درازیٔ عمر کی دعائیں مانگیں آنکھ مچولی کی "سگریٹ چھوڑ تحریک" میں شامل ہو کر اسے موثر بنایئے۔

کیا آپ نے بھی کوئی روشن مثال قائم کی ہے ؟

اس تعارفی سلسلے میں صرف وہی ساتھی شریک سکیں گے جنہوں نے کسی بھی شعبے میں کوئی نمایاں کام یا اہم کامیابی حاصل کی ہو مثلاً امتحان میں پوزیشن، مختلف نوعیت کے مقابلوں میں کامیابی، کوئی اہم سماجی کام، کوئی اور کارنامہ ......

○ ...... اپنی کامیابی کی تصدیق اپنے تعلیمی ادارے کے سربراہ سے ضرور کروائیں ورنہ تعارف شائع نہ ہو سکے گا۔

○ ...... آپ کی تصویر ایک خاص سائز میں مطلوب ہوگی۔ سائز کے لئے ایک فریم شائع کیا جارہا ہے۔ تصویر اس سائز سے بڑی ہو نہ چھوٹی۔ تصویر صاف کٹی ہوئی ہو ورنہ کسی طور شائع نہ ہو سکے گی۔

یاد رہے ! ہر ماہ شائع ہونے والے تعارف میں سے بہترین اور زیادہ باصلاحیت ساتھی کو (BEST OF MONTH) کا خطاب دیا جائے گا اور اس کا تعارف ٹیلی ویژن سمیت مختلف اداروں کو بھجوایا جائے گا تاکہ اس کی صلاحیتوں کو قومی سطح پر متعارف کروایا جاسکے۔

○ ...... پرائمری سے بارہویں تک کے طلباء و طالبات اس میں شریک ہو سکتے ہیں مگر طالبات کے پتے شائع نہیں کئے جائیں گے۔ ○ ...... کوپن کا آنا شرط ہے جو صفحہ نمبر ۱۳۵ پر موجود ہے۔

امی ابو کا صفحہ

ہما سلیم

نئی نسل کی کردار سازی اور تربیت کے لئے راہ نما خطوط

اکثر بچوں میں بہانے بازی کی عادت ہوتی ہے۔ ادھر آپ نے کوئی کام بتایا ادھر اس نے ایک جھوٹ گھڑ کر آپ کو سنا دیا۔ ''امی میری ٹانگ میں تو شدید درد ہو رہا ہے۔'' یا کوئی ایسا جواب جو یہ ثابت کر سکے کہ وہ یہ کام کرنے سے فی الوقت قاصر ہے اسکول جانے والے بچوں میں عموماً بیماری یا تکلیف کے بہانے بنانے کی عادت عام ہوتی ہے۔ ''آج مجھے بخار ہے۔'' ''آج میری طبیعت اچھی نہیں ہے۔'' ''آج میرے سر میں درد ہے۔'' وغیرہ وغیرہ پھر جوں جوں اسکول کا وقت ختم ہونے کو آتا ہے۔ ان کی بگڑی ہوئی طبیعت بھی بہتر ہونے لگتی ہے۔

بعض بچے تو اپنی اس فرضی بیماری پر اتنی عمدہ اداکاری کر لیتے ہیں کہ ان پر ذرہ برابر بھی شک نہیں ہوتا۔ امتحان کے دنوں میں ایسے حیلے بہانے تو اور بھی زیادہ بڑھ جاتے ہیں یہ کوئی اچھی صورت نہیں مگر اس سے بھی زیادہ تکلیف دہ صورت یہ ہے کہ آپ اکثر والدین یہ جاننے کی کوشش ہی نہیں کرتے کہ بچہ ایسا کیوں کر رہا ہے۔ جھوٹ بولنے اور بہانے بنانے کی ضرورت اسے کیوں پیش آئی وغیرہ۔ آپ غور کیجئے تو ہر طرح کی وجوہات سامنے آئیں گے۔

نمبر ۱..... بچہ سست اور کاہل ہے اپنے کام وقت پر نہیں کر پاتا۔ اپنی اصل ذمہ داریوں سے فرار نے اسے ایسا بنا دیا ہے۔ یقیناً ایسا بچہ نظم و ضبط اور راست گوئی کے ماحول میں نہیں پلا بڑھا۔

نمبر ۲..... بچے کو اس کی غلطیوں پر اساتذہ یا والدین کی طرف سے آئے دنوں سرزنش ہوتی ہے لہٰذا سزا کے خوف کے باعث اسے جھوٹ بولنے یا بہانے بنانے میں وقتی عافیت نظر آتی ہے۔

ان دونوں صورتوں یا ان میں سے کسی ایک صورت میں بچے کے لئے آپ کا کردار نہایت اہم ہے۔

اپنے بچے کے مسئلے کو سمجھنے کی کوشش کیجئے اس مسئلے پر تشویش میں مبتلا ہونے کے بجائے اس کی شخصیت کی اصل الجھن کو سمجھیے اور اسے کسی دلچسپ پزل کی طرح حل کرنے کی کوشش کیجئے۔

یاد رکھیئے اگر آپ کے اپنے طرزِ عمل اور رویوں میں وقتی تسکین اور فائدوں کے لئے جھوٹ اور بہانے بازی کی عادت شامل ہے تو بچہ بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

سب دوستوں کے لئے
ایک دوستانہ مشورہ
پیارے دوستو!
آپ کی طرح مجھے بھی سوئیٹس، ٹافیز اور ببل بے حد پسند ہیں لیکن میں خریدتے وقت بہت احتیاط سے کام لیتی ہوں اور صرف مے فیئر خریدتی ہوں۔
کیونکہ یہ بہترین اجزا سے صحت کے اصولوں پر تیار ہوتی ہیں اور سب سے زیادہ مزیدار ہیں۔
—— آپ سب دوستوں کے لئے 'میرا دوستانہ مشورہ ——
ہمیشہ مے فیئر کی سوئیٹس اور ٹافیز کھائیں۔ اپنی صحت کا خیال رکھیں۔
■ مے فیئر سوئیٹس اور ٹافیز ■ مے فیئر ببل ■ مے فیئر ملکا چیو
■ مے فیئر فروٹا چیو (اورنج اور اسٹرابیری)
Fruta Chew
Fruta Chew
Milka Chew
mayfair
-the sweet favourites
Bubble
Bubble
candy

REGD. No. M-266 MARCH 1991
MONTHLY AANKH MICHOLLE KARACHI

AHMED

PRODUCT OF PAKISTAN
AHMED
ORANGE
MARMALADE
Net wt.14.oz (400 g)
Manufactured by
AHMED FOOD INDUSTRIES (PVT) LTD.
D-112, S.I.T.E. KARACHI-10

Orange Marmalade
Orange Ahmed Made

Nature Produces taste
Ahmed Preserves it.